فون نمبر: 5863260
5862956
مدیر: چوہدری ریاض احمد
Email: centralanjuman@yahoo.com
رجسٹرڈ ایل نمبر: 8532
قیمت فی پرچہ-/10 روپے

جلد نمبر 97 | 14 ربیع اوّل تا 14 ربیع الثانی 1431 ہجری - یکم تا 31 مارچ 2010ء | شمارہ نمبر 6-5

احمدیہ انجمن لاہور کی خصوصیات

- آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، نہ نیا نہ پرانا۔
- کوئی کلمہ گو کافر نہیں۔
- قرآن کریم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں نہ آئندہ ہوگی۔
- سب صحابہ اور آئمہ قابل احترام ہیں۔
- سب مجددوں کا ماننا ضروری ہے۔

اس شمارے میں

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی بعثت کی غرض قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا قیام اور اسلام کا دفاع تھا

اللہ سے ہمکلامی اور پیشگوئیوں کے لئے صوفیا اور اولیاء کی اصطلاحات کو مخالفین نے بگاڑ کر اسلام کے لئے بانی سلسلہ احمدیہ کے موثر علم کلام اور دفاع اسلام کے لئے خدمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے

خطبہ جمعہ بر موقع سالانہ دعائیہ مؤرخہ 25 دسمبر 2009ء

جامع دارالسلام ، نیو گارڈن ٹاؤن ، لاہور

فرمودہ حضرت امیر ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

ترجمہ: ''اور اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔ میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔ یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں، متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں۔ اور اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں'' (سورۃ بقرۃ ۲:۱۔۶)۔

یہ سورۃ بقرہ کی پہلی پانچ آیات ہیں۔ آج کا خطبہ میرے باقی خطبات سے جن میں وعظ و نصیحت اور نیکی کے کاموں کی تحریک اور دین کے لئے جوش اور قربانی پیدا کرنے پر زور ہوتا ہے، ذرا مختلف ہے۔ آج اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں دین اسلام کے لئے جو درد اور تڑپ پیدا کی ہے اس کا بطور خاص میں ذکر کرنا چاہوں گا۔ گذشتہ سالانہ دعائیہ پر ہم نے بانی سلسلہ احمدیہ کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں اس عظیم مجدد دین کے کارناموں کا ذکر کیا تھا۔ جس نے دنیا میں مظلوم اسلام کے سوحانی پیکر کو دلائل، براہین اور زندہ خدا کے نشانات کے ساتھ دیگر ادیان پر غالب کر کے دکھایا۔ لیکن ہمیں آج یہ سوچنا ہے کہ ہم سب حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب جو قادیان میں پیدا ہوئے اور اس وجہ سے قادیانی کا لفظ ان کے نام کا جزو بن گیا، ان کو ہم زمانے کا مجدد مانتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ مسیح موعود بھی تھے جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے اور جنہوں نے عیسائیت کے حملوں کے خلاف اسلام کا دفاع کیا۔ اور بحثیت مہدی کے جنہوں نے مسلمانوں میں دین کی صحیح روح اور سوچ کو پیدا کیا۔ ان دونوں لحاظ سے وہ مسیح موعود اور مہدی معہود کہلائے۔

تحریک احمدیہ لاہور کا یہ موقف ہم ہر مجلس، ہر ملکی اور غیر ملکی اجتماعات میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ملک کے اندر ہم اپنے ان خیالات کا اظہار کھلے بندوں قانوناً نہیں کر سکتے۔ لیکن جس حد تک ممکن ہوتا ہے ہر جگہ ہر مجلس ہر اجتماع میں ہم اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں اپنی کاوشیں اور اسلام کے دفاع کے لئے تحریک کے افکار کا ذکر تقریر اور تحریر میں کرتے رہتے ہیں۔ ہماری جماعت کے ایک قابل وکیل جن کی وفات ہو چکی ہے جب کبھی بھی سالانہ دعائیہ یا کسی اور موقع پر تقریر کرتے تو

ایک ایڈووکیٹ ہونے کی وجہ سے وہ احتیاطاً یہ ضرور کہتے کہ یہ باتیں میں ایک بند کمرہ یا عمارت میں کہہ رہا ہوں تا کہ قانونی طور پر ان پر کوئی گرفت نہ ہو سکے۔

خدا کا شکر ہے اس وقت ہم بند جامع میں جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اور جب کبھی بھی میں یا میرے ساتھی کسی کونشن میں شرکت کرتے ہیں تو تحریک احمدیہ لاہور کے خیالات اور پیغامات اس محدود جگہ سے نکل کر ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ آج اس موقع پر بھی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں گو وہ اس جامع کی حدود کے اندر ہے لیکن لائف ٹرانسمشن کے ذریعے جو اس وقت ہو رہی ہے اللہ کرے بہت سے لوگ اسے دیکھ رہے ہوں اور دیگر بہت سے لوگ اس کی ریکارڈنگ کو سنیں گے اور جو لوگ ہمارے ویب سائٹ کو دیکھتے رہتے ہیں وہ کسی وقت بھی اس کو سن سکیں گے اور دیکھ سکیں گے اور اس کے بعد بھی یہ سب کچھ آنے والے سالوں تک محفوظ رہے گا۔ جب گذشتہ سال ووکنگ، انگلستان میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے صد سالہ یوم وصال کے سلسلہ میں احمدیہ کونشن کا اجلاس ہوا تو وہاں کے میئر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب مجھے اس اجلاس کا دعوت نامہ موصول ہوا تو میں نے ساری رات انٹرنیٹ پر اس جماعت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ بانی سلسلہ احمدیہ کو فوت ہوئے اب ایک سو سال نہیں بلکہ ایک سوایک سال ہو گئے ہیں۔

حالات اور قانون نے حد بندیاں تو لگا دی ہیں اور اس سلسلے میں اس وقت مجھے ایک نوجوان اور سرگرم دوست کی یہ مثال یاد آ رہی ہے جو کئی سال پہلے انہوں نے اپنی ایک تقریر کے دوران دی تھی کہ چڑیا گھر میں جب ہاتھی کو لایا جاتا ہے تو زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے اور کچھ سالوں بعد جب اس کی زنجیریں کھول دی جاتی ہیں تو وہ اپنے علاقے سے باہر نہیں نکلتا اور ذہنی طور پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اسی جگہ کا ہی ہوں۔ ہمیں بھی ایسی ہی زنجیروں میں 1974ء میں جکڑ دیا گیا تھا اور پھر 1984ء میں ایک اور ڈکٹیٹر نے مزید پابندیاں لگا دیں کہ کسی کو السلام علیکم نہ کہو، اذان نہ دو، قرآن مجید کی آیات کے عربی متن کو اخبار میں نہ لکھو وغیرہ وغیرہ۔ کسی نے اگر دعوت نامے پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ دیا تو وہ جرم ہے اور اس کو قید اور جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مجھے یاد ہے کہ مانسہرہ میں ایک احمدی ماہ رمضان میں اعتکاف میں بیٹھا ہوا تھا تو اسے پولیس گھر سے اٹھا کر لے گئی تھی۔

قانون اور مذہبی تعصب نے ہمارے پاؤں میں جو زنجیریں ڈالی ہیں اس کی وجہ سے ہم کئی لحاظ سے مجبور ہیں۔ ہماری دوسری نسل بھی انہی پابندیوں کے بوجھ تلے پروان چڑھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ہماری عاجزانہ دعا ہے کہ وہ ہمارے لئے وہ دن لاوے کہ ہماری عبادت گاہیں اذان کی آوازوں سے گونج اٹھیں۔ ہم کھلے بندوں خدا کی درگاہ میں سجدہ ریز ہو سکیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے آپ کو اسی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جائیں جس طرح کہ ایک عام مسلمان دیکھا جاتا ہے۔ میں جب ایبٹ آباد کے میڈیکل کالج میں تھا تو انتہائی خاموشی سے نماز ادا کیا کرتا تھا اور اگر سفر میں نماز ادا کرنا ہوتی تو ظاہراً اشارہ بھی نہ کرتا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ بیٹھ کر کیوں نماز پڑھ رہا ہے۔ لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود جماعت جو کچھ کر سکتی ہے سو وہ کر رہی ہے۔ حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کی طرف جو دعویٰ نبوت منسوب کیا جاتا ہے اس کے رد میں انہی کی تحریروں سے 257 حوالے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یکجا طور پر کتابی شکل میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔ جو اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انہوں نے کبھی بھی حقیقی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن اب اس کو پھیلانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کی طرف ہماری توجہ کم رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر کتب شائع کی گئی ہیں۔

ہماری جماعت کو بھی 2014ء میں سو سال ہو جائیں گے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور نے صحیح وقت پر یہ سمجھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ تحریک غلط لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے اور انہوں نے تحریک کو غلو کی راہ پر ڈال دیا ہے اور یہ غلو کی راہ ایسے عقائد پر مبنی ہے جس سے اسلام کے دفاع کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ چنانچہ بانی سلسلہ احمدیہ کے قریب ترین ساتھیوں کی علمی بصیرت اور دینی غیرت نے اس تحریک کو غلو سے بچانے کا ارادہ کر لیا اور 1914ء میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور کی بنیاد ڈالی۔ اس نام سے ہی اس بات کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ تحریک احمدیت کا بنیادی مقصد ہی اشاعت اسلام ہے۔ اگر ہم غور کریں تو لاہور احمدیہ تحریک ہی بانی سلسلہ احمدیہ کے صحیح عقائد اور اسلامی نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ 1974ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے فیصلہ کے بعد ہمارے موقف کی زیادہ تشہیر کی ضرورت ہے اور اس بات کی طرف سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ کس طرح اس موقف کو موثر طریق پر پیش کیا جائے۔ مرکزی انجمن لاہور نے 20 جلدوں پر مشتمل ''افکار محمد علی'' چھاپی ہیں۔ میں نے ابھی اس کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ لوگ بھی جب ان بیس جلدوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور نے تحریک احمدیت کے علمی فکر کے ذریعے اسلام کا کس رنگ میں دفاع کیا۔ اور آج کے دور میں اسلام کی تصویر کس قوت ایمانی اور بصیرت سے پیش کی۔ ان جلدوں میں مضامین، تقاریر اور تبلیغ اسلام کے لئے تحریکات کی تفصیل کو پڑھ کر تحریک احمدیت کے مشن کی تصویر کا صحیح خاکہ ذہن میں آ جائے گا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں بعض اوقات الجھن پیدا ہوتی ہے کہ امام وقت مجدد وقت بھی تھے، مسیح موعود بھی اور مہدی بھی۔ کیا ان کو

ماننے سے دین میں ہم کوئی اضافہ کر رہے ہیں؟ جبکہ قرآن مجید کہہ چکا ہے کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور اسلام میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں رہی۔ اور رسول اکرم صلعم کا واضح فرمان ہے کہ انا خاتم النبین لانبی بعدی یعنی میں نبیوں کا ختم کرنے والا ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں یعنی اب امت کی اصلاح کے لئے نبی نہیں بلکہ مجددین آئیں گے جو اصلاح کا کام کریں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ پھر بھی اس امام وقت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا حالانکہ انہوں نے بار بار اس کا انکار کیا اور ایسے مدعی نبوت پر لعنت بھیجی ہے اور جب کبھی لفظ نبی استعمال کیا تو اس کی تشریح بھی فرمائی۔ اگر انہوں نے نبوت کا دعویٰ ہی کرنا تھا تو اس کی تشریح و توضیح اور سب سے بڑھ کر انکار کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ ان کی کتابوں کو پڑھ جائیں تو آپ کو ایسی تحریریں کثرت سے ملیں گی جو اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتی ہیں کہ واقعی انہوں نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کی تحریرات میں سے 257 ایسے واضح حوالوں کا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

جو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں وہ قرآن پاک کی سورۃ بقرہ کے بالکل شروع میں آتی ہیں۔ ان میں ایک مومن کے ایمان کا یہ حصّہ قرار دیا گیا ہے کہ ”جو غیب پر ایمان لاتے ہیں“۔ حیرت کی بات ہے غلو کے شکار ہمارے بھائی ان الفاظ کے فوراً بعد جو الفاظ آتے ہیں ان کو سرے سے چھوڑ کر اس سے اگلی آیت کے الفاظ کو لیتے ہیں جس کے سادہ معنی یہ ہیں ”اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں“۔ تمام مفسرین نے آخرت کے معنی یوم آخرت کئے ہیں۔ اور اگر دونوں آیتوں کو سامنے رکھا جائے تو یوم آخرت کے علاوہ اور کوئی معنی اس کے ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن بدقسمتی سے الآخرۃ کے معنی ”بعد میں آنے والی وحی“ کئے جاتے ہیں جو غلو کی انتہاء ہے۔

شیخ محمدی، پشاور کے ہمارے محترم بھائی سردار علی خان صاحب نے پاکستان کے ایک بڑے مولانا صاحب کو یہی آیات پڑھ کر ان کے معنی کئے اور پھر آخر میں آیت نمبر 5 کا ترجمہ سنایا کہ ”یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔“ اور پوچھا کہ ایسے لوگ جو مذکورہ آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم بھی ان پر لفظاً اور ایماناً یقین رکھتے ہیں تو ان کے متعلق کفر کا فتویٰ لگانے کی کیا کوئی گنجائش ہے؟ مولانا صاحب خاموش ہو گئے اور کہا کہ اس بارے میں پھر کبھی بات ہوگی۔ لیکن جب خدا تعالیٰ کہتا ہے: ”یہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو ان کے پاس ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں“ اور ان تمام پر ان کا کامل ایمان ہے جو وحی کی صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور اس کے بعد کسی اور وحی پر ایمان نہیں لاتے جو ایمان کا جزو ہو اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرآن مجید واضح الفاظ میں نہ صرف مسلمان قرار دیتا ہے بلکہ ان کو کامیابی کی یقین دہانی بھی کرتا ہے۔ قرآن مجید تو ہمیں مسلمان قرار دے ہی رہا ہے لیکن اس قسم کے فتوے کی تو انسانی حقوق کا چارٹر بھی اجازت نہیں دیتا۔ اور جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تشریح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ عمارت جس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی وہ میرے آنے سے اب پُر ہو گئی ہے اور اب کسی اور اینٹ یا نبوت کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے میری ان بھائیوں سے دردمندانہ التجا ہے جو بانی سلسلہ احمدیہ پر نبوت زبردستی ٹھونس رہے ہیں کہ وہ اپنے اس موقف پر نظر ثانی کریں اور اس مقدس ذات کو جو اسلام کے دفاع کے لئے مبعوث ہوئی تھی دشمن اسلام نہ کہلوائیں۔ اس غلط موقف کے اختیار کرنے سے ہمارے وہ بھائی کیا خدمت اسلام کرنا چاہتے ہیں میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہی تحریک احمدیت کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں تو پھر ہمارا فرض اولین ہے کہ اس کے پیغام اور نظریات کی ہر طریق پر تشہیر کریں خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع۔ اس دور میں مغرب اسلام اور بانی اسلام پر ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ رکیک حملے کر رہا ہے اور ہمارے مسلمان بھائی ان حملوں کا جواب دینے کی بجائے محض احتجاج اور تشدد کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ جو مسلمانوں کے متعلق مزید غلط تاثر پیدا کر رہے ہیں۔

وہ گروہ جو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو نبی کا درجہ دیتا ہے انہوں نے اب بانی سلسلہ احمدیہ کی تحریرات سے بڑھ کر قرآن مجید کو بنیاد بنا کر ”امکانات اجراء نبوت“ کے عنوان سے تفسیر کرنی شروع کر دی ہے۔ اس لئے بانی سلسلہ احمدیہ کے دعاوی اور ان کی بعثت کی اصل غرض کو نئے حالات اور دلائل کے پیش نظر نئے انداز میں پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب اور انکے رفقا نے قرآن مجید، حدیث اور بانی سلسلہ احمدیہ کی تحریرات کی روشنی میں اس مسئلے پر بڑا مدلل اور مبسوط مواد فراہم کر دیا ہے۔ لیکن اب ہمارا کام ہے کہ اس سلسلہ میں سخت کوشش کر کے نئے اعتراضات اور غلو کے نئے انداز کو رد کریں اور امام وقت کے علم کلام کے صحیح موقف کو لوگوں تک پہنچائیں۔

میں نے آج خطبہ میں جو بانی سلسلہ احمدیہ کی طرف غلط طریق پر دعویٰ نبوت منسوب کرنے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تو میرا روئے سخن بنیادی طور پر ان بھائیوں کی طرف ہے جو غلو کا شکار ہیں اور جن کی وجہ سے بانی سلسلہ احمدیہ اور ان کے مشن کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور سب سے افسوس کی بات تو یہ ہے کہ کفر بازی کی جس وباء کو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ روکنا چاہتے تھے اسی وباء کو ان کی طرف غلط عقائد منسوب کر کے مخالفین کو کفر بازی کی وباء کو ہوا دینے کے مواقع فراہم کیے جا رہے

ہیں۔اس پہلو پر ہمارے بھائیوں کو نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

ہمارے محترم امیر سوئم حضرت ڈاکٹر اصغر حمید صاحب مرحوم و مغفور سے جب پوچھا جاتا تھا کہ قانون کے ذریعے جو ہم کو کافر قرار دیا گیا ہے تو اس سے کتنا نقصان ہوا ہے تو انکا فرمانا تھا کہ دنیاوی مشکلات میں تو ظاہر ہے کافی اضافہ ہوا ہے لیکن اصولی طور پر کلمہ گو کو کافر کہنا سب سے بڑی سزا ہے۔اور یہ ایک ایسی مثال قائم کی گئی ہے جس کی اسلامی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ پوری مذہبی تاریخ ایسی کسی مثال کا پتہ نہیں دیتی۔یہ اسلام کی ایک بڑی اہم اور بنیادی خصوصیت کے خلاف ورزی کی گئی ہے۔کیونکہ اسلام تو مذہبی آزادی اور انسانی حقوق کی ضمانت کو ایمانیات کا حصہ قرار دیتا ہے۔

بانی سلسلہ احمدیہ نے شروع سے آخر تک مجددیت کا دعویٰ ہی کیا اور حقیقی نبوت کی نفی کرتے رہے۔مخالفین اور خود جماعت احمدیہ کا وہ حصہ جو غلو کا شکار ہے وہ ''ایک غلطی کے ازالہ'' میں تصریحات سے لوگوں کو اس سلسلہ میں الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔اس وقت میں اس بحث میں نہیں جانا چاہتا۔میں اس وقت آپ کی توجہ اس تقریر کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو حضرت اقدس نے ۱۷مئی ۱۹۰۸ء کو احمدیہ بلڈنکس لاہور میں ''دعوت عام'' میں کی جس میں لاہور کے عمائدین اور رؤسا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔یہ تقریر دن کے گیارہ بجے شروع ہوئی اور دوپہر کے ایک بجے ختم ہوئی۔گذشتہ دنوں میں ''الحکم'' کی ۱۹۰۸ء کی فائل دیکھ رہا تھا۔میری نظر ۱۴جولائی ۱۹۰۸ء کے شمارہ پر پڑی جس میں یہ تقریر درج ہے۔یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حضرت اقدس نے یہ تقریر اپنی وفات سے ۹ دن پہلے فرمائی اور یہ آپ کی زندگی کی آخری تقریر تھی اور اس کے بعد آپ نے کوئی تقریر نہیں فرمائی۔

اس میں ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:

''یہ الزام کہ میں نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں اور مجھے فکر پڑی ہوئی ہے کہ میں الگ قبلہ بنالوں اور نئی شریعت ایجاد کروں۔ان تہمتوں کا جواب بجز **لعنة الله على الكاذبين** اور کیا دوں۔میرا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ چونکہ دین زندہ ہے اس لئے ہر صدی کے سر پر موجود مفاسد کے لحاظ سے مصلح پیدا ہوتا ہے جس سے خدا مکالمہ کرتا ہے۔جب خدا کسی سے بکثرت ہم کلام ہو اور اپنی غیب کی باتیں کثرت سے اس پر ظاہر کرے تو یہ نبوت ہے مگر یہ حقیقی نبوت نہیں۔اب میں تقریر ختم کرتا ہوں اور صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ خدا نے ہمیں تجدید دین کے لئے بھیجا ہے تا ہم تازہ نشانوں کے ساتھ دین کو تازہ کریں۔اگر خدا مجھے نہ بھیجتا تو آخر یہ دین بھی دیگر ادیان کی طرح قصوں کے رنگ میں رہ جاتا۔یہ یقیناً سمجھو کہ جو خدا کی طرف سے آتا ہے وہ کبھی نابود نہیں ہوسکتا۔

''مجھے افسوس آتا ہے کہ میں نے ان لوگوں (یعنی مکفر مولویوں) کا کیا بگاڑا ہے یہی کہ میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی زندہ نبی ہیں اور ان کا فیض قیامت تک جاری ہے''۔اس تقریر کو ''اخبار عام''، لاہور نے شائع کیا اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ حضرت اقدس نے اس میں دعویٰ نبوت سے انکار کیا ہے۔اس کا جواب بھی حضرت اقدس نے ۲۳مئی کو ہی لکھا۔میں اس وقت اس کی تفصیل میں بھی نہیں جانا چاہتا۔لیکن لاہور میں ''دعوت عام'' میں حضرت اقدس کی تقریر سے ایک بات نہایت وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ آپ نے بنیادی طور پر مجددیت کا دعویٰ کیا اور اس پر آخری وقت تک قائم رہے۔اور لفظ نبی جن معنوں میں اپنی تحریرات میں استعمال کیا اس کی ہمیشہ تشریح اور وضاحت کی۔چنانچہ آپ اپنی کتاب ''چشمہ معرفت'' میں جو حضرت اقدس کی وفات سے 10 دن پہلے شائع ہوئی۔اس میں آپ لکھتے ہیں:

''اسلام کی رو سے جیسا کہ پہلے زمانہ میں خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں سے مکالمہ مخاطبہ کرتا تھا۔اب بھی کرتا ہے اور ہم میں اور ہمارے مخالف مسلمانوں میں صرف لفظی نزاع ہے اور وہ یہ کہ ہم خدا کے ان کلمات کو جو نبوت یعنی پیشگوئیوں پر مشتمل ہوں، نبوت کے اسم سے موسوم کرتے ہیں۔اور ایسا شخص جس کو بکثرت ایسی پیشگوئیاں بذریعہ وحی دی جایں یعنی اس قدر کہ اس کے زمانہ میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو، اس کا نام ہم نبی لکھتے ہیں، کیونکہ نبی اس کو کہتے ہیں جو خدا کے الہام سے بکثرت آئندہ کی خبریں دے۔مگر ہمارے مخالف مسلمان مکالمہ الٰہیہ کے قائل ہیں لیکن اپنی نادانی سے ایسے کلمات کو جو کثرت پیشگوئیوں پر مشتمل ہوں، نبوت کے نام سے موسوم نہیں کرتے حالانکہ نبوت صرف آئندہ کی خبر دینے کو کہتے ہیں جو بذریعہ الہام ہو۔اور ہم سب اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ شریعت قرآن شریف پر ختم ہوگئی ہے صرف مبشرات یعنی پیشگوئیاں باقی ہیں'' (ص ص ۱۸۰،۱۸۱)۔

اب غور فرمایں کہ اپنی وفات سے چند دن پہلے ایک مقدس شخص ''عوامی دعوت'' میں تقریر میں اور پھر اپنی تحریر میں اور اس سے پہلے اپنی کتابوں میں بار بار ایک بات کی صراحت کرتا ہے۔لیکن افسوس اور حیرت ہے کہ الزام تراشی اور غلو کے جواز میں کبھی ایک تحریر سیاق وسباق سے ہٹا کر پیش کرکے اور کبھی ایک حدیث کے الفاظ کی غلط تشریح کرکے لوگوں کو بھڑکایا جاتا ہے۔مثلاً ہمارے غلو کے شکار بھائی اپنے موقف کی تائید میں حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں: **قولوا خاتم الانبياء ولا تقولوا لانبى بعده**۔یعنی کہو کہ نبیوں کا سلسلہ ختم کرنے والا ہوں اور یہ نہ کہو کہ اس کے بعد کوئی نبی نہیں۔بدقسمتی سے اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تو ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بعد نبی نہیں ہوں

گے۔ حالانکہ اس حدیث سے حضرت عائشہؓ نے لفظ خـاتـم النبیین کی جامعیت کو خاص اہمیت دی ہے کہ اس سے ہی نبیوں کا سلسلہ ختم ہونا یقینی ہے اور اس کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کہ یہ کہا جائے کہ ''لانبی بعدی'' کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ خود حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے کہا کہ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس پر میں لعنت بھیجتا ہوں اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ یہ فتویٰ تو وہ خود دے رہے ہیں۔ اب اگر اخبار ''الحکم'' میں 23 دن کے بعد جب ڈائری آتی ہے اور ڈائری بھی اس تقریر کے متعلق ہے جو وفات سے تقریباً بیس گھنٹے پہلے یعنی 25 مئی 1908ء ظہر کے وقت کی گئی تھی۔ پھر اس ڈائری میں جو ''البدر'' مورخہ ۲ جون ۱۹۰۸ء میں چھپی ہے اس میں ایک سرحدی شخص سے گفتگو کی تفصیل درج ہے جس کے اوپر ایڈیٹر صاحب کا یہ نوٹ بھی درج ہے: ''وفات سے قریباً ۲۰ گھنٹے پہلے کی تقریر''۔ سرحدی شخص سے پوری گفتگو کو میں من وعن آپ کو سناتا ہوں:

ڈائری

القول الطیّب

(وفات سے قریباً ۲۰ گھنٹے پہلے کی تقریر)

لاہور۔ ۲۸ مئی ۱۹۰۸ء ظہر

سلسلہ نبوت۔ ایک شخص سرحدی آیا۔ بہت شوخی سے کلام کرنے لگا۔ اس پر فرمایا۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی اپنا کلمہ نہیں بنایا۔ نہ نماز علیحدہ بنائی ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو دین وایمان سمجھتا ہوں۔ یہ نبوت کا لفظ جو اختیار کیا گیا ہے صرف خدا کی طرف سے ہے۔ جس شخص پر پیشگوئی کے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی بات کا اظہار بکثرت ہو اسے نبی کہا جاتا ہے۔ خدا کا وجود خدا کے نشانوں کے ساتھ پہچانا جاتا ہے اسی لیے اولیاء اللہ بھیجے جاتے ہیں۔ مثنوی میں لکھا ہے۔ **آن نبی وقت باشداے مرید۔** محی الدین ابن عربی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ حضرت مجدد نے بھی یہی عقیدہ ظاہر کیا ہے پس کیا سب کو کافر کہو گے۔ یاد رہے کہ اور یہ سلسلہ نبوت قیامت تک قائم رہے گا۔

مجدد کی ضرورت۔ اس پر اس سرحدی نے سوال کیا کہ دین میں کیا نقص رہ گیا تھا جس کی تکمیل کے لئے آپ تشریف لائے۔ فرمایا۔ احکام دین میں کوئی نقص نہیں۔ نماز۔ قبلہ۔ زکوٰۃ۔ کلمہ وہی ہے۔ کچھ مدت کے بعد ان احکام کی بجا آوری میں سستی پڑ جاتی ہے۔ بہت سے لوگ توحید سے غافل ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اپنی طرف سے ایک بندے کو مبعوث کرتا ہے۔ جو لوگوں کو از سر نو شریعت پر قائم کرتا ہے۔ سو برس تک سستی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک لاکھ کے قریب تو مسلمان مرتد ہو چکا ہے۔ ابھی آپ کے نزدیک کسی کی ضرورت نہیں۔ لوگ قرآن چھوڑتے جاتے ہیں۔ سنت نبویؐ سے کچھ غرض نہیں۔ اپنی رسوم کو اپنا دین قرار دے لیا ہے اور ابھی آپ کے نزدیک کسی کی ضرورت نہیں۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ اس وقت تو سب کافر ہو گے کوئی تیس چالیس مومن رہ جائیں گے۔

فرمایا: کیا مہدی کے ساتھ جو مل کر لڑائی لیں گے۔ وہ سب کافر ہی ہوں گے۔

آپ نے کیا اصلاح کی۔ پھر اس شخص نے پوچھا کہ آپ نے کیا اصلاح فرمائی۔ فرمایا۔ دیکھو چار لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے میرے ہاتھ پر فسق وفجور اور دیگر گناہوں اور فاسد عقیدوں سے توبہ کی۔ انسان جب فسق وفجور میں پڑتا ہے تو کافر کا حکم رکھتا ہے۔ کوئی دن نہیں گزرتا جب کئی اشخاص توبہ کرنے کے لئے نہیں آتے۔ ہر امر میں اللہ کی طرف رجوع کرنا ایک بڑی بات ہے۔ مسلمانی صرف یہی نہیں جیسے تم سمجھتے ہو۔ نیکی کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ ریاکاری کے ساتھ عمل باطل ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ ایسا زمانہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ عمل کرنا مشکل ہے۔ دنیا کی طرف لوگوں کی توجہ ہے۔ ہر صدی کے سر پر اس قسم کی غلطیوں کو مٹانے اور توجہ الی اللہ دلانے کے لئے مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر ہر صدی پر مجدد کی ضرورت نہ تھی بلکہ بقول آپ کے قرآن کریم اور علماء کافی تھے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض آتا ہے۔ حج کرنے والے حج کو جاتے ہیں۔ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سو برس کے بعد مجدد آئے گا۔ مخالفین بھی اس بات کے قائل ہیں۔ پس اگر میرے وقت میں ضرورت نہ ہوتی تو پیشگوئی باطل ہو جاتی ہے۔ ظاہری حالات پر ہی جانا چاہیے۔ غیب کا حال تو اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

ویـل لـلـمـصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون (۱۰۷: ۴، ۵)

یعنی لعنت ہے ان نمازیوں پر جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ یہی فلاح وہی پاتا ہے اور وہی سچا مومن کہلاتا ہے جو نیکی کو اُس کے لوازم کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ بات اس زمانہ میں بہت کم لوگوں میں موجود ہے۔ پس ان اندرونی بیرونی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے میں اپنے وقت پر آیا۔ اگر میں خدا کی طرف سے نہیں تو یہ سلسلہ تباہ ہو جاوے گا۔ اگر میں خدا کی طرف سے ہوں تو یاد رکھو کہ مخالف پھر ناکام رہیں گے۔'' (اخبار ''بدر'' جلد ۲۳، مورخہ ۲ جون ۱۹۰۸ء)

(بقیہ صفحہ 9 پر)

رخصتی کے وقت حضرت ام المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہؓ کی عمر۔۱

غلام نبی مسلم ایم۔اے

(یہ عام روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے 6 سال کی عمر میں ہوا۔ اس بارے میں مسلمانوں کی اندھی عقیدت اور غیر مستند تاریخ دانوں اور بعض مسلمان مفسرین کے اس موقف کو غیروں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو بلاوجہ ایک نہایت ناپاک الزام لگانے کا موقع فراہم کیا۔ دور حاضر کی ایک عیسائی مصنفہ نے بھی اس روایت کو من وعن اپنی کتاب ''محمد زمانہ حال کے پیغمبر'' میں درج کیا ہے۔ اور اس موقف کو اُس وقت کے عرب رواج کے مطابق جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس نے بھی رخصتی کے بارے میں بڑے واضح طور پر لکھا ہے کہ گو حضرت عائشہؓ سے بھی کم عمر کی لڑکیوں کے نکاح ہوتے تھے لیکن رخصتی اس وقت ہوتی تھی جب وہ بالغ ہو جاتی تھیں۔ لیکن اسی کتاب میں انہوں نے عیسائی ناقدین کے ان اعتراضات کا حوالہ بھی دیا ہے کہ (نعوذ باللہ) آپؐ ''بچوں کا شغل'' رکھتے تھے۔ ظاہر ہے اس میں واضح اشارہ رسول اکرم صلعم کا 6 سال کی کم سن لڑکی سے نکاح کی طرف ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے کتاب سے متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے: ''11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکہ کے دائیں بازو کی عیسائی تنظیموں اور مغربی میڈیا کے بعض حلقوں نے مخالفت کی اس روایت کو جاری رکھا ہوا ہے کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ محمدؐ ہمیشہ سے جنگی جنون کے عادی تھے اور کچھ تو اس حد تک چلے گئے ہیں کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ محمدؐ (نعوذ باللہ) ایک تخریب کار اور (نعوذ باللہ) بچوں کا شغل رکھتے تھے۔'' محترم غلام نبی مسلم صاحب کا نہایت علمی اور تحقیقی مقالہ ''رخصتی کے وقت حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی عمر'' اس انتہائی بے بنیاد اور حقیقت سے عاری روایت اور اس پر مبنی موقف کو رد کرتی ہے۔ جیسے کہ اس مقالہ سے واضح ہے۔ اس موقف کے خلاف پہلی آواز تحریک احمدیت کے معروف مفکر و مفسر قرآن حضرت مولانا محمد علی صاحب نے اٹھائی۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر سے اس انتہائی بدنما داغ کو دور کر کے ان کی مثالی پاکبازی کو قائم و دائم کیا۔ ادارہ)

کتب روایت میں عام طور پر اسی بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کاشانہ نبویؐ میں داخلے کے وقت حضرت عائشہؓ ۹ سال کی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؓ کا نکاح چھ سال کی عمر میں ۱۰ھ نبوت میں ہوا تھا۔ اگر یہ روایت بعینہ درست ہوتی تو ایک مسلمان کو اس کی صحت و حکمت پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم روایت و درایت کی روشنی میں دیکھیں تو صورت حال مختلف نظر آتی ہے اور یہ حقیقت کھلتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تشریف لے جانے کے وقت سیدہ عائشہؓ کا سن مبارک انیس بیس سال سے کم نہ تھا۔

چھ سال کی عمر میں نکاح کی تغلیط سے قبل اس دور کے دو فاضل سیرت نگاروں کی آراء ہدیہ قارئین ہیں تاکہ تصویر کے دونوں رخ پیش نظر رہیں۔ یہ دونوں سیرت نگار سید سلیمان ندوی مرحوم اور سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ جن کے تجر علمی کے متعلق دو آراء نہیں پائی جاتی ہیں۔

ا: سید سلیمان ندویؒ مرحوم اپنی بلند پایہ تصنیف ''سیرت عائشہؓ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہؓ کی ولادت کی تاریخ سے تاریخ وسیرؔ کی کتابیں خاموش ہیں۔ مؤرخ ابن سعد نے لکھا ہے اور بعض ارباب سیرؔ نے اسی کی تقلید کی ہے کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ نبوت کے چوتھے سال کی ابتداء میں پیدا ہوئیں اور نبوت کے دسویں سال چھ برس کے سن میں بیاہی گئیں۔ لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر نبوت کے چوتھے سال کی ابتداء میں ان کی ولادت مان لی جائے تو نبوت کے دسویں سال ان کی عمر ۶ سال کی نہیں بلکہ سات سال کی ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر کے متعلق چند باتیں متفقہ طور پر ثابت ہیں۔ ہجرت سے تین برس پہلے ۶ برس کی عمر میں بیاہی گئیں۔ شوال ۱ھ میں ۹ برس کی تھیں کہ رخصتی ہوئی۔ ۱۸ سال کی عمر میں یعنی ربیع الاول ۱۱ھ میں بیوہ ہوئیں۔ اس لحاظ سے ان کی ولادت کی صحیح تاریخ نبوت کے پانچویں سال کا آخری حصہ ہوگا۔ یعنی شوال ۹ھ قبل ہجرت مطابق ۶۱۴ء۔ آئندہ کے تاریخی واقعات سمجھنے کے لئے یہ جان لینا چاہیے کہ نبوت کے ۲۳ سال میں سے تقریباً ۱۳ سال مکہ میں اور دس مدینہ میں گزرے ہیں۔ حضرت عائشہؓ جب پیدا ہوئی تھیں تو نبوت کے چار سال گزر چکے تھے اور پانچواں سال گزر رہا تھا۔''

۲۔ مولانا مودودی ''حضرت عائشہؓ کے نکاح کی تاریخ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

(امام احمد۔ طبرانی۔ ابن طبری اور بیہقی کی ایک مفصل) روایت سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح حضرت سودہؓ سے پہلے ہوا تھا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے ۱۰ھ بعد بعثت کے ماہ شوال میں جب حضورؐ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا تھا۔ اس وقت وہ چھ برس کی تھیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ شوال ۱۰ بعد بعثت ۶ سال کی تھیں تو ہجرت کے وقت ان کی عمر ۹ سال کی ہونی چاہیے۔ اور معتبر روایت کی رو سے جب شوال ۲ھ میں ان کی رخصتی ہوئی تو وہ گیارہ سال کی ہونی چاہیں۔ حالانکہ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا نکاح ۶ برس کی عمر میں ہوا اور رخصتی ۹ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور حافظ ابن حجر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن امام نووی نے ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں اور حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ'' میں اور علامہ قسطلانی نے ''مواہب الدینہ'' میں قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ رخصتی ۲ھ میں ہوئی۔ حافظ بدرالدین عینی نے ''عمدۃ القاری'' میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ بدر سے واپس تشریف لانے کے بعد شوال ۲ھ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ امام نووی اور علامہ عینی دونوں نے اس قول کو واہی ضعیف قرار دیا ہے کہ یہ رخصتی ہجرت کے سات ماہ بعد ہوئی۔ اس کے بعد لازماً دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رخصتی ۲ھ میں ہوئی تو پھر نکاح کی تاریخ کون سی تھی جو حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح ۶ سال اور بوقت زفاف (رخصتی) ۹ سال سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کا جواب ہم کو بخاری کی اس حدیث سے ملتا ہے جو انہوں نے عروہ ابن زبیرؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اس میں حضرت عروہؓ کہتے ہیں کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی اور دو سال یا اس کے قریب مدّت تک توقف فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا۔ پھر ۹ سال کی عمر میں ان کی رخصتی ہوئی۔ اس سے حساب بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے کہ حضرت عائشہ کا نکاح ۶ سال کی عمر میں ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ہوا اور زفاف ۲ھ میں ہوا۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۷۶ء ص ۲۰)

یہ دونوں بزرگ ایک بات میں متفق ہیں کہ حضرت عائشہ کا نکاح ۶ سال کی عمر میں ہوا گو سید سلیمان ندوی کی رو سے سیدہ عائشہؓ کی پیدائش ۵ھ بعثت میں اور نکاح ۱۰ھ بعثت میں ہوا اور رخصتی شوال ۱ھ میں ہوئی۔ جب کہ سید مودودی صاحب کے حساب سے پیدائش ۶ بعثت میں ہوئی نکاح ۱۲ بعثت میں اور رخصتی شوال ۲ھ میں ہوئی۔

حق کی پہلی آواز

جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے حضرت عائشہؓ کی چھ سال کی عمر میں شادی کی روایت کے خلاف سب سے پہلی آواز جناب مولانا محمد علی صاحب لاہوری ایم اے، امیر جماعت احمدیہ لاہور نے بلند کی جب کہ انہوں نے اپنی انگریزی تصنیف ''محمد دی پرافٹ'' مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں حضرت عائشہؓ صدیقہ کی شادی کے سلسلہ میں لکھا:

ترجمہ: ''میں اس موقع پر حضرت عائشہؓ کی عمر سے متعلق ایک عام غلط فہمی دور کرتا جاؤں۔ یہ تو واضح ہے کہ آپ شادی کے وقت بالغ نہ تھیں لیکن یہ درست نہیں کہ آپ اس وقت ۶ سال کی کم سن لڑکی تھیں۔ اوّل تو یہ بات ظاہر ہے کہ آپ عمر کی اس منزل تک پہنچ رہی تھیں جہاں عام طور پر منگنی کر دی جاتی ہے اور اس طرح آپ شادی کے قابل ہو رہی تھیں۔ پھر ''اصابہ'' کا مصنف لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی فاطمہؓ کی ولادت اس وقت ہوئی جب کہ کعبہ کی تعمیر نو ہوئی۔ اور اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال تھی۔ جب بعثت کے دسویں سال ان کی شادی آنحضرت صلعم سے ہوئی تو ان کی عمر دس سال سے کم نہ تھی۔ اس نتیجہ کی تائید وتصدیق سیدہ عائشہؓ کے اپنے قول سے ہوتی ہے کہ جب سورۃ القمر نازل ہوئی تو ان دنوں وہ لڑکیوں سے کھیلا کرتی تھیں اور انہیں ان دنوں سورۃ کی چند آیات زبانی یاد تھیں۔ یہ سورۃ نبوت کے پانچویں سال کے بعد کی نہیں۔ اس واقعہ کی رو سے یہ بات درست نہیں کہ بعثت کے دسویں سال شادی کے وقت آپ کی عمر ۶ سال تھی کیونکہ اس صورت میں اس سورۃ کے نزول کے وقت تو یہ آپ کی پیدائش کا سال بنتا ہے جو بلاشبہ درست نہیں۔ ان حقائق کی رو سے شادی کے وقت آپ کی عمر دس سال تھی اور چونکہ آپ کی رخصتی پانچ سال بعد مدینے میں ہوئی اس لئے اس وقت آپ کی عمر پندرہ سال سے کم نہ تھی۔'' (ص ص ۳۸-۳۹)

مولانا محمد علی صاحب کی رائے پر تنقید کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے سیرۃ عائشہ کے تیسرے ایڈیشن میں لکھا:

''بعض بے احتیاط لوگوں نے اس خیال سے کہ کم سنی کی شادی آنحضرت صلعم کے لئے موزوں نہیں اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ ثابت کریں کہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ ۶ برس کی بجائے ۱۶ برس کی تھیں۔ لیکن یہ تمام کوشش بے سود اور

ان کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ حدیث و تاریخ کے پورے دفتر میں ایک حرف بھی ان کی تائید میں نہیں۔'' (نوٹ نمبر۲ ''سیرت عائشہ'' ص ۲۶)

تحقیق حق

ان تین علماء کی تحریرات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی تاریخ ولادت تو کسی کو بھی معلوم نہیں اور سن ولادت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ نکاح کے سال کے متعلق بھی ہم آہنگی نہیں اور رخصتی کا سن بھی مخدوش ہے۔ ان حالات میں یہ گنجائش موجود ہے کہ ان بزرگوں کی تصریحات کا جائزہ لیا جائے اور حقیقت کی نقاب کشائی کی جائے۔

تاریخی شواہد

سب سے پہلے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں آنحضرت صلعم کو سیدہ عائشہؓ صدیقہ سے شادی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

''خدیجہ ایسی رفیق و غم گسار بیوی کی وفات کے بعد آنحضرت صلعم بہت ملول رہا کرتے تھے۔ بلکہ اسی تنہائی کے غم سے زندگی بھی دشوار ہوگئی تھی۔ جان نثاروں کو اس کی بہت فکر تھی۔ حضرت عثمان بن مظعون (المتوفی ۲ھ) ایک مشہور صحابی ہیں۔ ان کی بیوی خولہ بنت حکیم آپؐ کے پاس آئیں اور عرض کی کہ یارسول اللہ! آپؐ دوسرا نکاح کرلیں۔ آپؐ نے فرمایا کس سے؟ خولہ نے کہا بیوہ اور کنواری دونوں طرح کی لڑکیاں موجود ہیں جس کو آپ پسند فرمائیں۔ اس کے متعلق گفتگو کی جائے۔ فرمایا وہ کون ہیں؟ خولہ نے کہا بیوہ تو سودہ بنت زمعہ ہیں اور کنواری ابوبکرؓ کی بیٹی عائشہؓ۔ ارشاد ہوا بہتر ہے تم اس کی نسبت گفتگو کرو۔'' (''سیرت عائشہ'' ص ۲۴)

سید سلیمان ندوی کی رائے میں سیدہ عائشہؓ سے آنحضرت صلعم کی شادی کا بڑا سبب غم، تنہائی اور غم گسار رفیقہ کی جدائی تھا۔ اس کی دو دیگر وجوہ بھی تھیں۔ ایک تو گھریلو مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے آپؐ کے مقصد رسالت کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ علاوہ ازیں گھر میں دو کم عمر صاحبزادیاں سیدہ فاطمہ اور سیدہ ام کلثوم تھیں جن کی دیکھ بھال کے لئے خاتون خانہ کی ضرورت تھی۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ آپ کسی ذہین، بالغ، سلیقہ منداور امور خانہ داری سے واقف عورت کو رفیقہ حیات بناتے۔ کسی چھ سالہ کمسن۔ ناپختہ کار لڑکی سے نکاح آپ کے گھریلو تقاضوں کی تکمیل نہیں کرسکتا تھا۔ ایک چھ سالہ لڑکی نہ تو غم گساری کرسکتی تھی نہ گھر کے کاروبار اور بچیوں کو سنبھال سکتی تھی بلکہ کم عمری کی وجہ سے آپ کی مشکلات میں اضافہ کا موجب ہی ہوسکتی تھی۔ ایسے حالات میں آنحضرتؐ نہ عائشہؓ سے شادی کا تصور کرسکتے تھے اور نہ ہی خولہ ایسی تجربہ کار، سنجیدہ اور عقلمند خاتون آپ کو ایسی شادی کا مشورہ دے سکتی تھی۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ جب حضرت خولہ نے آنحضرتؐ کے سامنے سیدہؓ عائشہ کے رشتے کی تجویز پیش کی تو کسی روایت میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ آنحضرتؐ نے سیدہ عائشہؓ کی کم عمری کا ذکر کرکے اس رشتے سے انکار کیا ہو۔ کہ وہ میری گھریلو ذمہ داریوں کو کیسے سنبھالے گی۔ بلکہ بلا تامل رضامندی کا اظہار کردیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدہ عائشہؓ اپنی عمر کے لحاظ سے بالغ ہوچکی تھیں اور آنحضرت صلعم کی نظر میں آپؓ گھر سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اسی طرح جب حضرت خولہ نے حضرت ابوبکرؓ سے آنحضرت صلعم کے لئے سیدہ عائشہؓ کا رشتہ طلب کیا تو انہوں نے ہرگز یہ عذر نہ کیا کہ عائشہؓ ابھی کمسن اور نابالغ ہے۔ وہ آنحضرتؐ کی عائلی ذمہ داریاں پوری نہ کرسکے گی۔ اس کے برعکس سیدہ عائشہ کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ اس سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے سیدہ عائشہؓ کی سگائی جبیر بن مطعم کے لڑکے سے کررکھی تھی اور آنحضرت صلعم کا پیغام پہنچنے پر یہ نسبت منقطع کرکے سیدہ عائشہؓ کا نکاح حضور اکرمؐ سے کردیا۔ کیا یہ سب کچھ ایک چھ سالہ گڑیاں کھیلنے والی لڑکی کے بارے میں ممکن ہوسکتا تھا۔ یا سیدہ عائشہ صدیقہؓ اس وقت بالغ اور باشعور تھیں۔ ذیل میں ہم روایت و درایت پر دو لحاظ سے سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے سن ولادت، نکاح اور رخصتی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ قارئین متقدمین کے اسمائے گرامی اور ان کے دعاوی سے مرعوب ہونے کی بجائے حقائق کی روشنی میں کوئی رائے قائم کریں گے۔ اور تاریخ کو عقیدے کی عینک سے نہیں دیکھیں گے۔

ابن جریر طبری

دور اول کے مشہور مورخ ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: ''زمانہ جاہلیت میں ابوبکرؓ دو خواتین کو عقد میں لائے۔ پہلی خاتون فتیلہ بن عبدالعزیٰ تھیں۔ جس سے عبداللہ اور اسماء پیدا ہوئے۔ پھر اُم رومان سے شادی کی جس سے عبدالرحمٰن اور عائشہ پیدا ہوئے۔ اور یہ چاروں اسلام سے پہلے پیدا ہوئے۔ **فکل هاؤلاء الاربعة من اولاده ولدوا من زوجيه التين سمينا هما فى الجاهلية**۔ ابوبکرؓ کی اولاد میں چاروں زمانہ جاہلیت میں ان دونوں بیبیوں سے پیدا ہوئے۔ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔'' (جلد۴ ص ۵۰)۔

سیدنا ابوبکرؓ کی اُم رومان سے شادی ۲۸ سال کی عمر میں ہوئی۔ آنحضرتؐ

ابوبکرؓ سے دو سال بڑے تھے۔ اگر اُم رومان کے بطن سے سیدنا ابوبکرؓ کے دونوں بچے (عبدالرحمٰن اور عائشہ) شادی کے ابتدائی چار پانچ سال میں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے تو عبدالرحمٰن سے چھوٹی سیدہ عائشہ یقیناً بعثت سے پانچ چھ سال قبل پیدا ہوئیں۔ جب کہ آنحضرت صلعم کی عمر ۳۴۔۳۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ تاریخ سے یہ بھی عیاں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف لڑے۔ اگر اس وقت ان کی عمر ۲۱۔۲۲ سال ہو تو ان کی پیدائش بعثت سے نو یا دس سال پہلے ہوئی۔ اور اگر سیدہ عائشہؓ ان سے تین چار سال چھوٹی ہوں تو وہ بھی بعثت سے پانچ چھ سال قبل پیدا ہوئیں۔ اور اگر عام روایت کے مطابق وہ ۵ بعثت میں متولد ہوئیں تو ہمارے پاس یہ تسلیم کرنے کی کوئی شہادت نہیں کہ وہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن سے چودہ پندرہ سال چھوٹی تھیں۔

بقیہ از صفحہ 5

خطبہ جمعہ حضرت امیر ایدہ اللہ

اس گفتگو کے بعد حضرت اقدس کی یہ بات بھی ''البدر'' کی ڈائری میں چھپی کہ پھر مولانا نورالدین صاحب جو پہلے جانشین منتخب ہوئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت کتاب ''مرقات الیقین'' جو اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے مرتب کی تھی اور جو شرکتہ الاسلامیہ لیمیٹڈ، ربوہ نے 1962ء میں شائع کی تھی اس کے صفحہ 47 پر یہ لکھا ہے: (اس کتاب کے شروع کے دو ایڈیشن 1912ء اور 1951ء میں اور پھر 1979ء میں تیسرا ایڈیشن احمدیہ انجمن، لاہور نے ہی شائع کئے تھے)۔'' میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ تمام نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئیں بلکہ اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں اور بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف تمام نبوتوں کے جامع اور خاتم تھے بلکہ آپؐ خاتم النبیین، خاتم الرسل اور خاتم کمالات انسانی تھے۔ یہ میرا یقین ہے کہ تمام انبیاء اور تمام اولیاء اور تمام انسانی کمالات کے آپؐ جامع اور خاتم ہیں اور اب آپؐ کے بعد میرا واہمہ بھی تجویز نہیں کرتا کہ کسی شخص میں ایسے کمالات ہوں''۔

خلاصتاً یہی موقف اور حقائق ناصر احمد صاحب نے احمدیہ بلڈنگس کی تاریخ اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے لاہور میں قیام اور وفات کے متعلق اپنی جیبی کتابچہ میں بھی درج کئے ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت اقدس آخری لمحوں میں بھی کلمہ شہادت کہتے کہتے اللہ کا نام لیتے لیتے اپنی جان اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ کیا کوئی نبی کسی اور نبی کا کلمہ پڑھتے ہوئے جان دیتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ تو نے نبوت بھیجی میں نے حق ادا کر دیا۔ لمبی بحثوں میں کبھی وقت ضائع نہ کریں۔ غلو کا شکار لوگ اگر آپ ان سے گھنٹوں بھی گفتگو کریں گے تو کچھ برآمد نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ عامر عزیز الازہری صاحب نے آکسفورڈ میں ایک قادیانی بھائی سے تین گھنٹے تک بحث کی پھر ان کو میرے پاس لے آئے اور کہا آپ ان سے کوئی سوال کر لیں۔ میں نے پوچھا کہ میرے سیکرٹری سے تین گھنٹے تک کیا گفتگو ہوئی۔ ابھی کچھ رہ گیا ہے تو مجھ سے پوچھ لیں۔ وہ تھوڑا مسکرائے اور تھوڑا شرمائے۔ پھر نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے انہیں کہا آئیں نماز پڑھ لیں۔ نہیں نہیں مجھے کچھ کام ہے۔ وہ کچھ اور پوچھنا چاہتے تھے لیکن نماز کا نام لیتے ہی جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ وہ تعلیم ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ضرور ان کو دل سے بھائی سمجھتے ہیں لیکن وہ صرف زبان سے بھائی سمجھتے ہیں۔ ان کو کسی لاہوری احمدی کے پیچھے نماز پڑھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ کسی کو لاہوری احمدی کے بچے کا جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں۔ حد یہ کہ لاہوری جماعت کے ساتھ تعلقات کو یوں تشبیع دی جاتی ہے کہ جیسے مجبوری میں گندے ڈھیر سے کوئی پھل یا سبزی اٹھا کر کھالے۔ جو تعلیم اس قسم کے تعصب اور تنگ دلی کا سبق دیتی ہے اس میں روحانی بلندی کا کوئی پیغام نہیں۔

آپ نے ابھی عثمان الٰہی ملک کی تقریر سنی۔ یہ بچہ تعریف کے قابل ہے۔ اس میں آپ نے سنا کہ کس خوبصورتی اور علمیت سے اس نوجوان نے بیان کیا کہ جسمانی عالم اور روحانی عالم میں قانون ارتقاء کس طرح کارفرما ہے اور وہ کیا کیا منازل طے کرتے ہیں اور دونوں کس طرح انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور قرآن مجید ان دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کر کے کن رہنما اصولوں کو انسان کی رہنمائی کے لئے پیش کرتا ہے۔ اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں ان حقائق کے ذریعے کس موثر انداز اور بصیرت سے قرآن کی عظمت کو ثابت کیا ہے۔ لیکن اس علم کلام کو سمجھنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ہمیں مسلسل کوشش اور محنت کرنا ہوگی۔

آپ نے دیکھا ابھی ثمینہ ملک صاحبہ نے فلپائن میں امریکہ جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں کی تفصیل بتائی ہے۔ اور جن مشکلات کا انہوں نے ذکر کیا۔ ایمان اور اخلاص کے بغیر ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت اور استقامت دے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس دعائیہ کو کامیاب بنائے اور میرے نزدیک اس کی تکمیل اور کامیابی یہی ہوگی کہ جو کچھ ہم سنتے ہیں یا وعدہ کرتے ہیں اس پر عمل کریں اور کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں۔

انگریزی سے ترجمہ: فائزہ عرفان علی (ایم ایس ایڈ)۔ قسط: دوم

مسلمانوں کے غیر مسلم لوگوں سے تعلقات کی نوعیت

ڈاکٹر زاہد عزیز، ایم ایس سی، پی ایچ ڈی (انگلستان)

عبداللہ یوسف علی

''صرف ذاتی دفاع کے لئے لڑائی کرنا جائز ہے لیکن وہ بھی واضح حدود کے اندر۔ جب جنگ لڑی جائے تو وہ پوری طاقت اور ہمت سے لڑی جائے جس کا بنیادی مقصد اللہ کی عبادت کے لئے امن اور آزادی کو قائم کرنا ہو۔ بہر حال متعین کردہ حدود کی کسی صورت میں بھی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور کمزور لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ نہ درختوں کو کاٹا جائے اور نہ ہی فصلوں کو برباد کیا جائے۔ اگر دشمن امن کے لئے شرائط ماننے کو تیار ہو جائے تو اس سے ہرگز پہلو تہی نہ کی جائے''۔ (قرآن مجید ۲:۱۹۰ نوٹ ۲۰۴)

''عام الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام امن، خیر خواہی، باہم افہام و تفہیم اور خیر سگالی کا دین ہے اور اس دین کے ماننے والے کبھی بھی برائی کی حمایت نہ کرینگے۔ اور عزت، عدل اور دین کے تقدس کے لئے جان دینے کو ارزاں سمجھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بنیادی مقصد ایک دلیرانہ نیکی کی زندگی گزارنا ہے جس میں بے نفسی، شرافت اور رحم دلی کا عنصر غالب ہونا چاہیئے''۔

(قرآن مجید ۲:۱۹۱ تفسیری نوٹ ۲۰۵)

''اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ نفس کو جس حد تک ممکن ہو قابو میں رکھیں۔ طاقت ایک خطرناک ہتھیار ہے۔ اس کو صرف ذاتی دفاع یا خود حفاظتی کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن ہمیں ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں نفس پر قابو رکھنا اس کو زیادہ عزیز ہے۔ جب ہم لڑائی کر رہے ہوتے ہیں وہ ایک اصول کی خاطر ہونی چاہیے اور اس میں ذاتی اغراض یا جذبات پیش نظر نہ ہوں''۔ (قرآن مجید ۲:۱۹۴ تفسیری نوٹ ۲۱۰)

محمد مارماڈیوک پکھتال

پکھتال ایک برطانوی ناول نویس تھے جنہوں نے 1917ء میں اسلام قبول کیا۔ اور اسلام پر لیکچر دیتے رہے اور ان کا قرآن مجید کا ترجمہ دسمبر 1930 میں شائع ہوا۔ چند معروف تراجم میں شمار ہوتا ہے۔ 1919 کے اوائل میں لندن میں ایک تقریر یا خطبہ میں جو بعد میں ''رواداری'' کے عنوان سے شائع ہوا اس میں انہوں نے کہا:

''مذہبی تحمل اور رواداری اسلام کی اصل روح ہے۔ قرآن مجید اس کو فرض قرار دیتا ہے اور محمد صلعم نے اپنی زندگی میں بطور ایک نبی اور ایک حاکم ہونے کی حیثیت میں جنگ اور امن دونوں صورتوں میں اس کو عملاً کر کے دکھایا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس بارے میں قواعد کا اعلان کیا جن کو کوئی بھی غلط مفہوم نہیں پہنایا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک اچھے عقیدہ اور قوم کو اچھا بدلہ دیگا۔ اس کی بنیاد یہ نہیں کہ وہ کن چیزوں پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس بات پر کہ ان کے اعمال کیسے ہیں اور انہوں نے کس حد تک انسانیت کی خدمت کے کام کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاف رکھے ہم مسلمان جن کے پاس مستقل طور پر رحم دلی اور رواداری کے سلسلہ میں اللہ کے مقدس احکام ہیں ہم نے اپنی گذشتہ تاریخ میں کافی حد تک تعصب اور بے عملی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اس سے لوگوں کو یہ رائے نہ قائم کر لینی چاہیے کہ ہم مسلمان اس قسم کا جو رویہ اختیار کرتے ہیں تو ہم رسول اکرم صلعم کے عظیم اسوہ کی پیروی کرتے ہوئے ایسا کر رہے ہیں یا ہمارا دین اس کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جب ہم ایسے غلط رویئے کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہم اس عظیم نمونہ کو قطعاً نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں اور ہم دین کو جھٹلا رہے ہوتے ہیں۔

''اب از راہ کرم اس کے اثر سے اپنے ذہنوں کو صاف کر لیں۔ کہ محمد صلعم جنگ میں ایک انتہائی جنونی یا سخت گیری کا رویہ اپناتے تھے یا انہوں نے کبھی بھی اپنی زندگی میں ایک ظالم کا سا رویہ اختیار کیا ہو۔ بارہ سال تک مکہ میں انہوں نے انتہائی ظلم و ستم میں صبر و تحمل کا رویہ اختیار کئے رکھا۔ حالانکہ وہ کسی وقت بھی کفار مکہ کے کسی طبقہ یا قبیلہ کی مدد سے اپنی حفاظت کر سکتے تھے اور انہوں نے آخر کار خود کو اور اپنے صحابہؓ کو ایک جگہ ہجرت کر کے لے گئے جہاں کے لوگوں نے مقابلۃً ان کا زیادہ ساتھ دیا اور وہ امن قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ جب دشمن ایک بڑی فوج لے

کر جنگ کے لئے روانہ ہو گیا تا کہ ان کو اس جگہ جہاں وہ نسبتاً امن سے رہ رہے تھے نکال باہر کرے اور مسلمانوں کی جمعیت کو برباد کردے۔تب جا کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جنگ کرنے کی اجازت دے دی۔دشمن کی اب یہ کوشش تھی کہ وہ جنگ، قتل وغارت، ظلم وستم اور دھوکا دہی کے ذریعہ اسلام کو نیست و نابود کردے۔لیکن اس حالت میں بھی رسول اکرم صلعم نے جب مکہ فتح کرلیا تو انہی لوگوں کو معاف کر دیا۔اس سے قبل دنیا نے معافی اور رحمدلی کا ایسا مظاہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔

''جہاں تک یہودیوں اور عیسائیوں اور ان لوگوں کا تعلق ہے جو ایک خدا کی عبادت اور یوم حساب پر ایمان رکھتے ہیں اگر چہ ان کے پادریوں اور ربانیوں نے سچائی کو بیکار قسم کے تصورات سے دھندلا کر دیا ہے۔اسی طرح یہ مسلمان صحیح راستہ سے بھٹک گئے ہیں ان میں وہ بھی ہیں جو اچھے کام کرتے ہیں اور جو دوسروں پر ظلم وستم نہیں ڈھاتے ان کو بھی تو مسلمان ہی گردانا جاتا ہے۔رسول اکرم صلعم نے یہودیوں اور عیسائیوں سے انتہائی رواداری کا سلوک کیا۔اور ان تمام مذاہب کے لوگوں کو ہر دور میں مسلمانوں کی سرزمین میں آباد ہونے کی آزادی تھی۔لیکن ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے رسول اکرم صلعم پر حملہ کیا یا ان سے دغا بازی کی آپؐ نے ان کی مخالفت کی اور سزا دی۔لیکن اس سے ان مذاہب کے متعلق آپ کی رواداری میں کوئی کمی نہ آئی۔لیکن رسول اکرم صلعم اور اوائل کے مسلمانوں نے کبھی بھی مذہبی رواداری کے ارادہ میں کمزوری نہ آنے دی اگر چہ ان پر چاروں طرف سے مشکلات کا سامنا اور تباہی کا خطرہ لاحق تھا۔عیسائیوں کے خلاف جنگوں میں انہوں نے گرجاؤں، راہب خانوں اور مذہبی شخصیتوں کی عزت واحترام کا خاص خیال رکھا اور کبھی مخالف لوگوں کا طریق اختیار نہ کیا اور لوگوں کو اپنا دین اختیار کرنے کے لئے زبردستی کا طریق اختیار نہ کیا۔اسلام کی تعلیمات میں یہ طریق کار ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور صدیوں تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا اگر چہ مسلمانوں نے بعض اوقات اس بارے میں غفلت بھی برتی۔''

۳۔ علامہ محمد اسد صاحب

علامہ محمد اسد لیوپولڈ وائس پیدائشی طور پر ایک یہودی تھے جو 1900ء میں پیدا ہوئے۔اسٹریا میں پل کر جوان ہوئے۔آپ نے 1926ء میں اسلام قبول کیا۔ان کے قرآن مجید کا معروف انگریزی ترجمہ ''قرآن مجید کا پیغام'' کے نام سے جبرالٹر سے 1980 میں شائع ہوا۔ان کی وفات 1992ء میں ہوئی۔ان کے تفسیری حواشی میں سے اقتباس ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

''مذہب یا ایمان کے بارے میں زبردستی استعمال کرنے کی قطعی مناہی کی بنیاد کے بارے میں تمام مسلمان فقہا کسی استثنا کے بغیر اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قسم کے طاقت کا استعمال ہر حال میں غلط اور غیر موثر ہے۔اور ہر ایسا عمل یا کوشش کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے کے لئے یا اس سلسلہ میں طاقت یا زبردستی اختیار کرنا ایک بد ترین گناہ ہے۔یہ حتمی فیصلہ اس عمومی اور وسیع پیمانے پر کئے جانے والے غلط اور بے بنیاد جھوٹ کو کہ اسلام غیر مسلموں کے سامنے ''اسلام یا تلوار'' میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی پیش کش کرتا ہے یکسر رد کرتا ہے''۔ (۲۵۶:۲ حاشیہ نمبر ۲۴۹)

''نتیجتاً اس اصطلاح کے وسیع تر تناظر میں جہاد کا مطلب اللہ کی راہ میں کوشش کرنا ہے۔دوسرے لفظوں میں اس کا اطلاق نہ صرف باقاعدہ جنگ پر بلکہ ہر ایسی نیک کوشش جو اخلاقی طریق پر کی جائے پر بھی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر رسول اکرم صلعم نے انسان کے اپنے جذبات اور کمزوریوں کے خلاف کوشش کو سب سے بڑا جہاد کہا ہے۔''(۹۵:۴ حاشیہ نمبر ۱۲۲)

''یہ اور مندرجہ ذیل آیات میں نہایت غیر مبہم الفاظ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو دفاعی (لفظ کے وسیع تر مفہوم میں) جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔اللہ کی راہ میں دفاعی جنگ مندرجہ حوالہ یعنی ''ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو تمہارے خلاف جنگ کریں'' اس کی مزید وضاحت ۳۹:۲۲ میں یوں کی گئی ہے:

''ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا''۔ابتدائی دفاعی جنگ کا یہ بنیادی اصول جس ضمن میں جنگ کی اجازت دی گئی ہے اس اصول کو سارے قرآن مجید میں اپنایا گیا ہے اور اس کا واضح ذکر ۶۰:۸ میں موجود ہے۔اسی طرح ۹۱:۴ کے آخر میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔یہ دونوں آیتیں مندرجہ بالا آیت کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں''۔

(۱۹۰:۲ حاشیہ ۱۶۷)

''پس اگر چہ ایمان لانے والوں کو جنگ کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔مندرجہ بالا آیت کے آخری الفاظ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ جب جنگ کی جائے تو ہر قسم کے ظلم وستم سے پرہیز کیا جائے جس میں جنگ میں حصہ نہ لینے والے بھی شامل ہیں''۔(۱۹۴:۲ حاشیہ ۱۷۲)

''ان احکامات کے مطابق اگر وہ امن کی طرف رجوع کریں تو تم بھی اس طرف رجوع کرو'' (۶۱:۸)۔

اور ''اگر وہ لڑائی سے احتراز کریں۔تو تمام قسم کی دشمنی کو ختم کر دیا جائے''۔

(۱۹۳:۲)۔ اس طرح ایمان لانے والوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ دشمن سے صلح کریں جو برابری کی بنیاد پر سمجھوتے کے لئے آمادہ ہو۔ اسی طرح ان کو دشمنوں کے ان افراد کے لئے نرمی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے جو دشمنی کی کارروائیوں میں شریک نہیں''۔ (۸۶:۴ حاشیہ ۱۰۵)

۴۔ ٹی۔ بی اِروِنگ صاحب

ڈاکٹر تھامس اروِنگ ایک عالم اور کئی کتب کے مصنف تھے۔ جن کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ انہوں نے 1950ء کے لگ بھگ اسلام قبول کیا اور پھر قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو 1985ء میں امریکہ میں شائع ہوا۔ قرآن مجید کے ترجمہ میں جہاد کے بارے میں اپنے ایک مقالہ میں انہوں نے تحریر کیا:

''ایک اور نکتے کا ذکر کر دیا جائے۔ جہاد یا روحانی ترقی کے لئے کوشش اسلام کے پانچ ارکان میں سے نہیں ہے۔ اس لفظ کے صحیح ترجمہ میں اس کا ہرگز مطلب مقدس جنگ نہیں۔ ہاں اس کے وسیع معنوں میں اس کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بنیادی معانی میں اس کو شامل کرنا اس تصور کے تقدس کو اس کے مقام سے گرانا ہے۔ گو یہ لفظ صحافت میں ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (اسلامک پرسپکٹیو: اسلامک فاؤنڈیشن، انگلستان، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۲)۔

مولوی چراغ علی صاحب

مولوی چراغ علی صاحب نے 1885 میں حیدرآباد دکن سے انگریزی میں ایک مبسوط کتاب ''جہاد کے معروف تصور کے بارے میں تنقیدی جائزہ'' (A Critical exposition of the Popular Jihad) جو 350 صفحات پر مشتمل تھی شائع کی۔ اس کے ابتدا میں ہی انہوں نے لکھا:

''اس کتاب کے شائع کرنے کا میرا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں یورپی اور عیسائی ذہنوں میں جو عام طور پر غلط تاثرات ہیں ان کو دور کیا جائے کہ رسول اکرم صلعم نے ملکوں کو فتح کرنے کی خاطر جنگیں کیں تا کہ قریش اور عرب میں رہنے والے عیسائیوں، یہودیوں اور دیگر قبائل کو ختم کر کے ان کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اور یہ کہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور ان کے ذریعہ وہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ میں نے اس کتاب میں کوشش کی ہے اور اس میں میں نے کافی مفید مواد فراہم کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نہ تو رسول اکرم صلعم نے جنگیں علاقوں کو زیرنگیں کرنے کے لئے کیں اور نہ ہی انہوں نے کسی طریق پر طاقت استعمال کیا اور نہ ہی مذہب کے بارے میں جبر سے کام لیا۔ رسول اکرم صلعم کی تمام جنگیں دفاعی تھیں''۔ (ص ۱)

آگے چل کر وہ ایک برطانوی مصنف کا حوالہ دیتے ہیں جو یہ الزام لگاتا ہے کہ ''اسلام کے ماننے والوں پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اس لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ ان لوگوں سے انتقام لیں جو ایمان نہیں لائے''۔ اس کا جواب دیتے ہوئے، مولوی چراغ علی صاحب لکھتے ہیں:

''محمد صلعم نے قبیلہ قریش اور یہودیوں کے خلاف جنگ اس لئے نہیں کی کیونکہ انہوں نے ان کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا نہ ہی اس لئے کی کہ وہ لوگوں سے اللہ کا انتقام لینے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اس کے بالمقابل آپ نے فرمایا: ''حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے سو جو کوئی چاہے ایمان لائے (۲۹:۱۸)''۔ ''دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں'' (۲۵۶:۲)۔ حالانکہ جن دنوں مسلمانوں اور اہل قریش دونوں میں سخت دشمنی تھی وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے تھے ان کو اجازت تھی کہ وہ آئیں اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں وعظ سنیں۔ اور پھر ان کو حفاظت سے اپنے گھروں تک پہنچایا جاتا تھا (۶:۹ ص ۴۲)۔

''محمد صلعم نے صرف دفاعی اغراض کے لئے تلوار اٹھائی۔ اگر مدینہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ اپنا دفاع نہ کرتے تاکہ قریش اور ان کے حلیف قبیلوں کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں تو عین ممکن تھا کہ ان کو برباد کر دیا جاتا۔ انہوں نے اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے اور اپنی اخلاقی اور مذہبی آزادی کی بقا کے لئے لڑائی کی۔

''اس پہلو سے اس جنگ کو مذہبی جنگ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں مخاصمت مذہبی بنیاد پر شروع ہوئی۔ قریش نے مسلمانوں پر ظلم وستم کئے اور ان کو مکہ سے نکال دیا۔ اس الزام کے نتیجہ میں کہ اسلام قبول کرنے والوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ دیا۔ یعنی بت پرستی کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا اور ایک خدا کی عبادت شروع کر دی۔ لیکن اس لحاظ سے یہ ایک مذہبی جنگ نہ تھی کہ کفار پر زیادتی کرنے کی غرض سے ان پر حملہ کیا جائے اور جبر سے اپنا مذہب ان پر ٹھونسا جائے''۔ (ص ۴۳)

مصنف نے ۳۰ صفحات پر مشتمل ایک تتمہ بھی اپنی کتاب کے ساتھ لکھا ہے جس میں قرآن مجید میں لفظ جہاد کے بارے میں صحیح مفہوم کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مستند عربی لغتوں کے حوالے بھی دیئے ہیں اور مغربی مصنفین کے ان غلط تراجم کو رد کیا ہے جو اس کو محض لڑائی کے معنوں میں ہی لیتے ہیں۔

مصنف لکھتے ہیں:

''جہاد کو دشمن سے لڑائی کے معنوں میں لینا صرف Post classical یعنی عرب لٹریچر کے بعد کے زمانہ میں اور جہاد کے اصطلاحی معنے ہیں جس سے مراد دشمن کے خلاف جنگ کرنا ہے''۔ (ص ۱۶۴)

''تمام اہل لغت، مفسرین اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جہاد کے معنی مستند عربی میں محنت، سخت محنت ہے۔ اس کے معنی میں تبدیلی یا اس کے اصطلاحی معنی اور اہمیت میں تبدیلی قدیم دور کے بعد اور قرآن مجید کی اشاعت کے بہت بعد میں آئی''۔ (ص ۱۷۰)

''جہاد کے معنی صرف جنگ کرنا ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے مترجمین، مفسرین اور قرآن مجید کی آیات کے تقابلی جائزہ سے یہ واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ لفظ جہد یا جہاد مستند عربی میں اور پھر جن معنوں میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے اس سے ہرگز مراد جنگ یا لڑائی کرنا نہیں بلکہ اس کا بنیادی معنی کسی کی انتہائی کوشش، محنت یا جفاکشی ہے۔ میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ قرآن مجید میں لڑائی کرنے کے احکامات نہیں ہیں۔ ایسی متعدد آیات موجود ہیں جن میں رسول اکرم صلعم کے ماننے والوں کو دفاعی جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن کوئی جارحانہ حملہ ہرگز نہیں۔'' (ص ۱۹۲)

۶۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال

علامہ سر محمد اقبال پاکستان کے قومی ہیرو اور دنیا کے معروف شاعر اور اسلامی فکر کے فلاسفر نے اپنے ایک اردو خط میں جہاد کے بارے میں یہ لکھا:

''ناقد نے یہ بات غلط لکھی ہے کہ اقبال اس ترقی یافتہ زمانہ میں جنگ کے حامی ہیں۔ میں جنگ یا جہاد کی بالکل حمایت نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی مسلمان شریعت کی واضح حدود کے پیش نظر ایسا کر سکتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق صرف دو قسم کے جنگ یا جہاد ہو سکتے ہیں۔ دفاعی اور اصلاحی یا تنبیہی۔ پہلی قسم جب مسلمانوں پر ظلم و تشدد کیا جائے اور ان کو گھروں سے در بدر کیا جائے تو ان کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

''دوسری قسم جس میں جہاد فرض ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں (۹:۴۹) کیا گیا ہے۔ ان آیات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ جس بات کو سر سیمول ہورے نے اقوام عالم کے ایک اجلاس میں ''اجتماعی تحفظ'' کہا ہے قرآن مجید نے اسی اصول کو نہایت سادگی اور بلاغت سے بیان کیا ہے۔ دو قسم کے جہاد یا جنگ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے میں اور کسی جنگ کا علم نہیں رکھتا۔ علاقوں کو فتح کرنے کے لالچ کو پورا کرنے کے لئے جنگ کرنے کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر اس بات کی بھی ممانعت ہے کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تلوار اٹھائی جائے''۔ (اقبال نامہ حصہ اوّل، مکاتیب اقبال، لاہور 1945 ص ص ۲۰۳، ۲۰۴)

۷۔ چیف جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب

ڈاکٹر ایس اے رحمان جو 1960 میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے۔ انہوں نے ایک کتاب ''اسلام میں مرتد کی سزا'' Punishment of Apostasy in Islam لکھی ہے۔ اس کے 140 صفحات ہیں جن میں مرتد کے مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید، حدیث اور قدیم اور جدید تراجم اور تفسیروں اور دیگر کتب کی روشنی میں نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور جس میں فقہا کے دلائل کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ ہم ذیل میں مصنف کی آرا اور نتائج کا ذکر کرتے ہیں:

''افراد کے ضمیر کے معاملہ میں قرآن مجید اس کی آزادی کے بارے میں کوئی پابندی نہیں لگاتا'' (ص 13)۔

''ایمان کے بارے میں دباؤ یا جبر کی قرآن کے سماجی نظام کے ڈھانچہ میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس بارے میں مسلمانوں کو رواداری اور انسانیت کے لیے جذبہ سے سرشار نہایت واضح ہدایت قرآن مجید کی متعدد آیات میں دی گئی ہے اور اس میں ایک سے زیادہ طبقوں یا خیالات کے لوگوں کے باہم مل کر رہنے کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے''۔ (ص ۱۵)

''ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے قرآن مجید نے ہدایات فراہم کی ہیں لیکن اس طریق پر نہیں کہ انسانی وقار کو مجروح کیا جائے۔ موت کے بعد کی زندگی میں مختلف نوعیت کی زندگی کے بارے میں وسیع تفصیلات جس میں دنیاوی زندگی کے اعمال کے اچھے نتائج حاصل ہونگے یہ سب باتیں اہل بصیرت لوگوں کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ لیکن زندگی گزارنے کے لئے اپنی پسند کی راہ اختیار کرنے کا حق بھی فرد کو دیا گیا ہے۔ کوئی بھی عمل جس میں زبردستی سے کام لیا گیا ہو، اس کی کوئی جزا نہیں۔ اسلام کو اگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مانا جائے تو اس میں ہر فرد کی رضا کارانہ انفرادیت اور آزادی کے حق کو قبول کرنا ہوگا۔'' (ص ۳۱)

''سماجی اور سیاسی نظام کے بارے میں ایک اصول جو اللہ کی کتاب میں

سب سے نمایاں نظر آتا ہے اس کو خلاصتاً ان معزز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ”دین میں کوئی جبر نہیں“۔ اس اصول کی تصدیق قرآن مجید کی متعدد دیگر آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں واضح طور پر اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے گو ان آیات میں صراط مستقیم سے انحراف کی کو ناپسند کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ حق اور باطل میں سے کسی ایک کو اختیار کرے اور یہ کہ رسول اکرمؐ کا کام صرف یہ ہے کہ ان تک پیغام کو پہنچا دیں اور اس کو اپنی زندگی میں عمل کر کے دکھائیں اور باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ لوگوں پر نگہبان نہیں کہ ان خاص عقائد کو اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ ضمیر کی آزادی اچھی زندگی کی ایک قابل قدر بنیاد ہے اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جب حدیث، خلفائے راشدین کے زمانے میں عمل اور فقہاء کی آراء میں بیان کردہ واقعات اور نتائج کا مطالعہ کیا جائے۔ تو اس سلسلہ میں اللہ کے کلام اور اس کی روح سے روگردانی نہ کرنی چاہیے۔ ہمارے مطالعہ کی بنیاد مطلق قرآنی آیات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کی سزا کو زندگی بعد موت تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اصل کفر کی سزا کا مرتب ہونا ہے۔ قرآن مجید میں قطعاً اس بات کا کوئی ذکر موجود نہیں کہ اس دنیاوی زندگی میں ایک مسلمان کو ایمان سے انحراف کی سزا دی جائے۔۔۔۔

ہر فرد کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مذہب کو مانے اور اس کی تبلیغ کرے جب تک وہ قانون اور اخلاق کی حدود کے اندر رہے۔ اور یہ کہ انہیں ایک پرامن شہری ہوتے ہوئے زندگی کے تمام تر سماجی حقوق دوسرے مسلمانوں کی طرح استفادہ کرنے کا حق بھی حاصل ہے“۔ (ص ص 13-131)

مرتب: اویس عامر

جلسہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

زیر اہتمام مقامی جماعت احمدیہ، لاہور

27 فروری 2010ء بروز ہفتہ مقامی جماعت احمدیہ، لاہور نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب کا اہتمام کیا۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کرنے کے بعد اجلاس شروع ہوا۔ تلاوت قرآن پاک عثمان احمد صاحب نے کی۔ محترم اطہر رسول صاحب نے معروف شاعر سلیم تابانی کا رسول اکرم صلعم کی خدمت میں ہدیہ نعت نہایت جوش اور ترنم سے سنایا۔ بعد ازاں محترم احمد شجاع صاحب نے سیرت پاک صلعم کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ ان کے بعد ناصر احمد صاحب نے تقریر کی جس میں انہوں نے ایک معروف مغربی عیسائی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ کی کتاب ”محمدؐ۔ زمانہ حال کے پیغمبر“ میں سے اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جس میں انہوں نے رسول اکرم صلعم کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کارناموں کو کافی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنفہ نے رسول اکرم صلعم کی سحر کن شخصیت اور ان کے بین الاقوامی اتحاد اور مساوات کے تصورات اور عملی اقدامات کو سراہا اور ان کی آج کے دور کے لئے اہمیت کا بھی ذکر کیا۔ ناصر احمد صاحب نے تقریر کے آغاز میں سورت علق کی پہلی پانچ آیات جو سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں ان میں علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں پڑھنے کی ہدایت کی اہمیت کو بیان کیا جس میں انسانی عظمت کو علم کے حصول کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے علم کے حصول کو انسانی عظمت کے لئے بنیادی شرط قرار دیا ہے اس کے بعد محترم عامر عزیز صاحب، جنرل سیکرٹری، مرکزی انجمن نے انسانی نفس کی پاکیزگی کے طریق اور مراتب کی تفصیل قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں بیان کی۔ اور یہ کہ اسی پر قوم کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے بھی تقویٰ اختیار کرنے پر بلکہ اس کی باریک راہوں پر چلنے پر زور دیا اور نیک اور صالح زندگی گذارنے کو ہی اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا۔ بعد ازاں قاری محمد ارشد صاحب نے سیرت رسول اکرم صلعم کے متعلق آنحضرتؐ کی زندگی سے سبق آموز واقعات سنائے جن پر عمل کر کے ہم معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں طریق پر رہنمائی اور کافی حد تک اصلاح بھی کر سکتے ہیں۔

آخری تقریر حضرت امیر ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب کی تھی جنہوں نے سلائیڈز کے ذریعہ قرآن مجید، بائبل، وید اور دیگر مذاہب کی مقدس کتب میں رسول اکرم صلعم کی آمد کی پیشگوئیوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اور پھر انہی میں رسول اکرم صلعم کے نام، ان کی قوم اور دین اسلام کی اہم خصوصیات سے متعلق عبارات کے ذکر کو بھی سلائیڈز پر دکھایا۔ دعا کے بعد احباب کو عشائیہ پیش کیا گیا۔

روٹرڈیم، ہالینڈ کے محترم عبدالستو صاحب

کی لاہور میں آمد اور مصروفیات

محترم عبدالستو صاحب روٹرڈیم، ہالینڈ سے دو ہفتوں کے لئے لاہور تشریف لائے۔ گو ان کی بیگم صاحبہ کچھ عرصہ سے بیمار ہیں لیکن وہ حضرت امیر ایدہ اللہ کی دعوت پر گرمی کے باوجود لاہور تشریف لائے۔ یہاں انہوں نے نماز فجر کے بعد درس قرآن مجید دیا۔ 19 مارچ 2010ء کو خطبہ جمعہ دیا اور 20 مارچ 2010ء کو جامع ہال، دارالسلام میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے دورانیہ کی ”قرآن مجید اور سائنس“ کے موضوع پر سلائیڈز کے ذریعہ علمی اور سائنسی معلومات پر مبنی تقریر کی۔ جس میں کائنات اور انسان کی تخلیق اور آسمان اور زمین کے مابین سیاروں اور کہکشاؤں کی گردش اور مختلف نظام شمسی کے متعلق حیرت انگیز کارکردگی کی تفصیل بیان کی۔ انہوں نے فرانسیسی میڈیکل سائنسدان بکلیلے کی انسانی جسم کے متعلق اور جیمز جینز کی کائنات کے متعلق تصورات اور انکشافات کا قرآن مجید کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا۔

مسلمانوں میں تعصب اور انتہا پسندی کا رویہ اور مغرب میں اس کے اثرات

از ناصر احمد، بی۔اے، ایل ایل بی

(سالانہ دعائیہ دسمبر 2009ء کے موقع پر ناصر احمد صاحب نے مندرجہ بالا موضوع پر اپنے خیالات اور مغربی مفکرین کی کتب سے حوالے پیش کئے تھے۔ لیکن چونکہ وقت کم تھا اس لئے وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکے تھے۔ اسی موضوع کا بقیہ حصہ انہوں نے خطبہ جمعہ ۱۲ مارچ ۲۰۱۰ء میں مکمل کیا۔ تقریر کا مکمل متن اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

''یہ لوگوں کے لئے بیان اور متقیوں کے لئے ہدایت اور وعظ ہے۔ اور نہ سست ہو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔۔۔۔ اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں نوبت بہ نوبت لاتے رہتے ہیں تا کہ اللہ ان کو جان لے جو ایمان لائے۔ اور تم میں سے شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔'' (۳:۱۳۸۔۱۴۰)

ایک انتہائی مخلص، عالم اور روشن خیال اسٹرین نومسلم جناب محمد اسد لیوپولڈ کا انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر ان کا شاہکار ہے۔ لیکن اسلامی دنیا میں اس کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

جناب اسد صاحب کی سب سے پہلی اور معروف کتاب Road to Makkah یعنی ''مکہ کی جانب سفر'' نے ان کو اسلامی دنیا میں متعارف کروایا۔ یہ آسٹرین مسلمان زیادہ تر سعودی عرب میں رہے اور وہاں کے شاہی خاندان سے ان کے نہ صرف گہرے مراسم رہے بلکہ یہ ان کو سیاسی معاملات میں مغربی اقوام کی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر کئی خفیہ مہمات پر گئے تا کہ ان کی رہنمائی کر سکیں۔ اس کتاب میں انہوں نے بڑی جرات سے مغربی اقوام اور بطور خاص برطانیہ کی مسلمانوں کے خلاف دجالی کارروائیوں کی تفصیل دی ہے۔ جو نہ صرف چونکا دینے والی ہے بلکہ خود مسلمانوں کے لئے لمحہ فکر بھی ہے۔ امام وقت نے مسلمانوں کو اپنی ابتدائی زمانے کی کتاب ''ازالہ اوہام'' میں جس درد اور فکر سے اس دجالی فتنہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اس بدقسمت قوم نے اسی مقدس ہستی کو دجال کا نام دیا اور اسے ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ اگر کسی مسلمان مفکر اور عالم نے امام وقت کی آخری زمانے کے علامات کی تعبیر کو سمجھا، جس کی علمی بصیرت قرآن کی تفسیر کی گہرائیوں تک گئی اور جس نے مسلمانوں کو دجالی فتنہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی وہ اسٹریا کا نومسلم محمد اسد لیوپولڈ تھا۔ لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ جس سرزمین کو دجالی خطروں سے بچانے کے لئے اور خادم حرمین شریفین کے ساتھ وفاداری کا دم بھرنے والے نومسلم نے اپنی ذہانت اور جان تک کو داؤ پر لگا دیا۔ جس کی تفصیل اس نے اپنی کتاب میں دی ہے۔ اسی سرزمین کے علماء کی ایک تنظیم ''رابطہ عالم اسلامی'' مکہ نے پہلے تو محمد اسد صاحب کی پہلی نو سورتوں کے انگریزی ترجمہ وتفسیر کو شائع کیا۔ لیکن جب اس ترجمہ وتفسیر میں وفات مسیح، قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ، جہاد، دجال، طلاق، قرآن مجید کی سورتوں کے شروع میں دیئے گئے مقطعات، اجتہاد، قرآن مجید میں تمثیلات، معراج نبوی صلعم اور قرآن مجید کی سزاؤں کے متعلق عین وہی تشریح کی جو حضرت مولانا محمد علی صاحب نے اپنے انگریزی ترجمہ وتفسیر میں کی تھی۔ جس کا پہلا ایڈیشن جب 1917ء میں شائع ہوا تو بقول برطانوی نومسلم مارماڈیوک پکتھال کے اسے الازہر یونیورسٹی کے صحن میں جلا دیا گیا تھا۔ محمد اسد صاحب کا ترجمہ وتفسیر بھی چونکہ کافی حد تک احمدی نکتہ نظر سے ہم آہنگ تھی۔ اس لئے سعودی عرب کے علمائے نے اسے بھی رد کر دیا۔ اور علماء کی سخت مخالفت کی وجہ سے اس ترجمہ کی کاپیوں کو بھی نہ صرف جلا دیا گیا بلکہ اس کی مزید طباعت اور اشاعت کو روک دیا گیا۔ محمد اسد صاحب کو اپنے مکمل ترجمہ اور تفسیر کی اشاعت کے لئے 16 سال تک صبر آزما وقت گذارنا پڑا اور پھر جبرالٹر جو اسلامی تاریخ میں جبل الطارق کے نام سے مشہور ہے وہاں کے ایک پبلشر نے اسے 1980ء میں شائع کیا۔

اب ذرا محمد اسد صاحب کی انگریزی کتاب ''مکہ کی جانب سفر'' میں دجال کے متعلق تشریح سنئے جو انہوں نے ایک عرب شیخ اور اس کے نوجوان بدو دوست سے گفتگو کے دوران پیش کی۔ گفتگو کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''اے شیخ! مجھے بتائیے۔ یہ کیا وجہ ہے کہ فرنگی ہمیشہ ہیٹ پہنے رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں کافی حد تک ڈھکی رہتی ہیں۔ اور وہ آسمان کیسے دیکھ پاتے ہوں

گے۔ شیخ نے ذرا آنکھ کو جھپکی دی اور کہا کہ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ کہیں آسمان دیکھنے سے ان کو خدا یاد نہ آجائے اور وہ نہیں چاہتے کہ ہفتہ کے دنوں میں کام کے دوران ان کو خدا یاد آئے۔

ہم سب نے قہقہہ مارا۔ لیکن نوجوان بدو کو اس بارے میں زیادہ معلومات کی تلاش تھی۔ اس لئے اس نے مزید سوال کر ڈالے۔ ایسا کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اتنا مہربان ہے کہ ان کو بے حساب مال و دولت سے نوازا ہوا ہے اور ایمان والوں کو ان سب سے محروم رکھا ہوا ہے؟

شیخ نے جواب میں کہا: اے میرے بیٹے۔ یہ بڑی سادہ سی بات ہے۔ وہ سونے کی پوجا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا معبود ان کی جیبوں میں ہے۔ لیکن میرے نوجوان دوست، شیخ نے کہا۔ اس مجلس میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جو فرنگیوں کے متعلق کافی علم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اندھیرے سے نکال کر اسلام کی روشنی عطا کی ہے۔

شیخ کے نوجوان بدو دوست نے مجھے مخاطب ہو کر کہا:

اے معزز بھائی۔ کیا ایسا ہی ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ آپ خود بھی ایک فرنگی رہ چکے ہیں۔ محمد اسد صاحب لکھتے ہیں کہ جب میں نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا تو اس نوجوان نے زیر لب ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا: کہ ''اللہ جس کو چاہتا ہے سچائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' اس نوجوان نے پھر سوال کیا: یہ کیا وجہ ہے کہ فرنگی اللہ تعالیٰ سے اس قدر غافل ہیں؟

اور جب اس نوجوان بدو نے میری طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا تو میں نے اس کو رسول اکرم صلعم کی اس عجیب الخلقت دجّال کے خروج یعنی ظاہر ہونے کی تفصیلات بتانی شروع کیں۔ جو ایک آنکھ سے اندھا ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ اس کو عجیب و غریب طاقتوں سے نوازے گا۔ وہ اپنے کانوں سے دنیا کے کناروں تک سن سکے گا۔ وہ ایک آنکھ سے ان چیزوں کو دیکھ سکے گا جو افق سے پرے بے انتہا فاصلوں پر ہوں گی۔ وہ دنوں میں پوری دنیا کا سفر کرلے گا۔ وہ زمین کے اندر سے انتہائی تیزی کے ساتھ سونے اور چاندی کے خزانوں کو نکال لے گا۔ وہ بارش کو برسانے کی اہلیت رکھتا ہوگا۔ پودے اس کے حکم سے اگ پڑیں گے اور پھر اسی کے حکم سے وہ مرجھا جائیں گے۔ پھر وہ تروتازہ ہو کر زندہ ہو جائیں گے۔ اور ایسے تمام لوگ جن کے ایمان کمزور ہوں گے وہ اس کو خدا کا درجہ دیں گے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے سجدے میں گر جائیں گے۔ لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوں گے وہ اس کے ماتھے پر آگ کے شعلوں میں لکھے ہوئے ''خدا کے منکر'' کے الفاظ کو پڑھ لیں گے۔ اور اس طرح ان کو پتہ چل جائے گا کہ دجال محض دھوکا ہے۔ جس کے ذریعہ لوگوں کے ایمان کا امتحان ہوگا۔ میں یہ بیان ختم کر چکا تو میرا بدو دوست میری طرف حیرانگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور زبان سے دھیمے لہجہ میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنے عرب دوست، جس کا وہ نوجوان بدو مہمان تھا۔ اس سے پوچھا کہ اے شیخ! کیا یہ تمثیل کے رنگ میں موجودہ صنعتی دور کی تہذیب کی سچی تصویر نہیں ہے؟ کیا یہ تہذیب صرف ایک آنکھ نہیں رکھتی جو زندگی کا صرف ایک ہی رخ دیکھتی ہے یعنی مادی ترقی۔ کیا یہ تہذیب نت نئی تیکنیکی ایجادات سے انسان کو دیکھنے کی قدرتی صلاحیت سے بڑھ کر اسے سننے اور دیکھنے کی قوت نہیں فراہم کرتی اور انسان کو اس قابل نہیں بنا دیتی کہ وہ اس کے تصور سے بڑھ کر تیز رفتاری سے دور کے فاصلے طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کیا اس کے سائنسی علوم مصنوعی طریق پر بارش کی طرح پانی فراہم نہیں کرتیں اور کیا یہ پودوں کو تیزی سے بڑھنے کی قوت عطا نہیں کرتی اور کیا یہ زمین کے نیچے سے اس جگہ سے خزانوں کو نکال نہیں لیتا ہے جس کا انسان کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ کیا اس کی ایجاد کردہ دوائیاں ان لوگوں کو جو موت کے منہ میں جا رہے ہوتے ہیں یہ زندگی عطا نہیں کرتی۔ لیکن وہ لوگ جو دلوں میں ایمان کو قائم رکھتے ہیں ان کو اس بات کی صحیح پہچان ہوتی ہے کہ دجال کی پرستش کا مطلب خدا کا انکار ہے۔ ان سوالات کے جواب میں شیخ نے تین دفعہ کہا: اے محمد اسد! تمہاری بات بالکل درست ہے۔ تمہاری بات بالکل درست ہے۔ تمہاری بات بالکل درست ہے۔ شیخ نے انتہائی جذباتی ہو کر کہا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ دجال کی پیشگوئی پر میں نے کبھی اس رنگ میں سوچا ہی نہیں۔ لیکن یقین جانو جو کچھ تم نے اس بارے میں کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

محمد اسد صاحب اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''انسان نے موجودہ ترقی اور سائنسی ایجادات کو خدا کی نعمت سمجھنے کی بجائے انتہائی ناسمجھی میں اسی کو زندگی کا مقصود سمجھ لیا ہے اور اسی کی پوجا شروع کر دی ہے۔''

محمد اسد صاحب مزید لکھتے ہیں:

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کا رہنے والا مذہب کی سچی سمت کو چھوڑ کر سائنس کی عظیم الشان ترقی سے کوئی اخلاقی فائدہ یا رہنمائی حاصل نہیں کرسکتا

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کا رہنے والا مذہب کی سچی سمت کو چھوڑ کر سائنس کی عظیم الشان ترقی سے کوئی اخلاقی فائدہ یا رہنمائی حاصل نہیں کرسکتا اور زندگی کے بارے میں اس کے اس رویہ کو قرآن مجید کے ذیل کی آیت نے بڑا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

''ان کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے آگ جلائی پھر جب اس آگ نے جو کچھ اس کے گرد تھا روشن کر دیا۔ اللہ ان کے نور کو لے گیا اور ان کو اندھیرے میں چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیکھتے نہیں۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے۔'' (۲:۱۷، ۱۸)

اور زندگی کے بارے میں اس کے اس رویہ کو قرآن مجید کے ذیل کی آیت نے بڑا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

''ان کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے آگ جلائی پھر جب اس آگ نے جو کچھ اس کے گرد تھا روشن کر دیا۔ اللہ ان کے نور کو لے گیا وران کو اندھیرے میں چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیکھتے نہیں۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے۔'' (۲:۱۷، ۱۸)

لیکن پھر بھی مغربی لوگ گھمنڈ میں اندھے ہیں اور اس یقین میں بتلا ہیں کہ صرف انہی کی تہذیب دنیا میں روشنی اور خوشی لائے گی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں انہوں نے عیسائیت کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ لیکن اب جبکہ ان کا اس سلسلہ میں جوش اور شدت کافی حد تک سرد پڑ چکا ہے اور وہ اب مذہب کو محض ایک پس پردہ میوزک سمجھنے لگے ہیں جو کسی حد تک سکون دیتا ہے لیکن اس کا حقیقی زندگی پر براہ راست کوئی اثر نہیں۔ اس لئے انہوں نے اب ''مغربی طرز زندگی'' کی مادی تعلیمات کی ہی تبلیغ پر زور دینا شروع کیا ہے اور ان کو یہ یقین ہے کہ تمام انسانی مسائل فیکٹریاں، تحقیقی تجربہ گاہیں اور اعداد و شمار اکٹھا کرنے والے ادارے ہی حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔''

ایک نومسلم اسٹرین کو تو دجال کی صحیح نوعیت کی سمجھ آ گئی۔ لیکن افسوس کہ مسلمان ابھی تک اس ایک آنکھ والے دجال کی تلاش میں ہیں جس کے ماتھے پر لفظ کافر واضح طور پر لکھا ہوگا۔ گو آج مغربی اقوام کی منصوبہ بندیوں اور تباہ کاریوں کو میڈیا، کالم نگار اور صحافی دجالی فتنہ تو کہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو ابھی تک اصل دجال کا پتہ نہیں لگ سکا۔

محمد اسد صاحب کی معروف کتاب میں سے میں نے دجّال کے متعلق ان کے عرب شیخ اور شیخ کے نوجوان بدو دوست کی گفتگو اور پھر محمد اسد صاحب کے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا مکہ، سعودی عرب میں جو حشر ہوا۔ اس کی تفصیل بھی سنا دی۔ اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے وفات مسیح اور آخری زمانے میں خروج دجال اور دیگر نشانیوں کی جو مدلل اور حقیقت پر مبنی تعبیر اور تشریح کی ہے اس کی بنیاد صرف اور صرف قرآن مجید اور احادیث تھیں اور اس سے قرآن مجید کی صداقت اور رسول اکرم صلعم کی روحانی بصیرت کی عظمت ثابت کرنا تھی۔ نہ کہ خود کو حضرت مسیح علیہ السلام کی جگہ تقدس کا لباس اوڑھ کر اپنی شخصیت کے لئے کوئی روحانی مقام حاصل کرنا تھا۔

آج امام وقت کی وفات کے سو سال بعد امت مسلمہ جن نازک حالات اور خطرات میں گھری ہوئی ہے اور جن غلط تصورات اور رویوں سے ابھی تک علماء چپکے ہوئے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کئے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم مسائل جہاد اور مسیح کی آمد ثانی ہیں۔ مغرب کے ذہین سیاست دان اور دانشور ان غلط تصورات سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک طرف انہی غلط تصورات کو وہ اپنے فائدہ کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ تو دوسری طرف انہی غلط تصورات کی بنا پر نہ صرف مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہرا رہے ہیں بلکہ ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے کوئی راہ فرار نہ رہے۔ اور وہ مجبور ہو کر تشدد پر آ تر آئیں اور ان حالات کو وہ پھر اسلام، مسلمانوں اور خود بانی اسلامؐ کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اب میں صلیبی جنگوں کے بعد مغربی دنیا کے مذہبی رہنماؤں، سیاسی مفکرین، دانشوروں اور مصنفین کے تعصب کی کچھ تفصیل محمد اسد صاحب کی ہی کتاب سے پیش کروں گا۔ جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے علماء کا ذہن آخری زمانے کے علامات، موجودہ حالات اور تقاضوں کو کس حد تک سمجھ سکا اور ایک نو مسلم کی بصیرت انہی علامات اور دجّالی قوتوں کی کارستانیوں کا کیا معنی خیز اور حقیقت پر مبنی تجزیہ کرتی ہے۔

محمد اسد صاحب اپنی کتاب ''مکہ کی جانب سفر'' میں لکھتے ہیں:

''صلیبی جنگوں نے یورپی تہذیب پر مجموعی طور پر کافی گہرے اثرات مرتب کئے اور ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ یورپ میں ایک اجتماعی احساس جنم لینے لگا۔ تاریخی اعتبار سے ان جنگوں نے یورپ میں تمدنی اتحاد کی تشکیل کے لئے کامیاب ابتدائی بنیاد فراہم کی۔ اس پورے براعظم پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک جوش کی لہر تھی جو ملکوں، قبیلوں اور طبقاتی تقسیم کی حد بندیوں کو پار کر گئی اور پھر اس کے نتیجہ میں یورپ کی تمدنی اکائی کی ابتدائی شکل نے جنم لیا۔ نومبر 1095ء میں پوپ اربن ثانی نے کلیر مونٹ کے مقام پر اپنی مشہور تقریر میں عیسائیوں کو ہدایت کی کہ وہ ''ظالم نسل'' کے خلاف جنگ کریں جو ارض مقدس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اس وقت ان کو شاید علم نہ تھا کہ مغربی تہذیب مستقبل میں کیا عملی شکل اختیار کرے گی۔''

اس اقتباس میں مسلمانوں کو ''ظالم نسل'' کہا گیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک نومسلم اسٹرین عالم محمد اسد اپنی کتاب میں مسلمانوں کے خلاف یورپی قوموں کے تعصب اور در پردہ دشمنی کا جائزہ پیش کر رہا ہے۔ یہاں میں اس بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ متحدہ یورپ کا خواب صلیبی جنگوں کے 900 سال بعد آج ایک عملی حقیقت کی صورت اختیار کر چکا ہے اور افغانستان میں جو نیٹو کی فوجیں ہیں اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو مسلمانوں کے خلاف ایک مرتبہ پھر یورپی طاقتیں صف آرا ہیں۔

اب میں اسی کتاب میں سے ایک اور اقتباس کا ترجمہ آپ کو سناتا ہوں کہ جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ صلیبی جنگوں کی راکھ میں دبی چنگاریوں سے آگ سلگتی نظر آ رہی ہے۔ لیکن ان چنگاریوں کو بھڑکانے کے لئے مغربی اقوام نے

حکمت عملی، دوراندیشی، سیاسی جوڑتوڑ اور سب سے بڑھ کر سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کو نہایت کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ آج یورپ کی تہذیبی برتری اور اس کے ایجاد کردہ فکری اور سائنسی ہتھیاروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ ہتھیار ان ہتھیاروں سے زیادہ کارگر ثابت ہوئے ہیں جن سے ان اقوام کو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ یورپی اقوام کے موجودہ طریق کار اور منصوبہ بندی نے مسلمانوں کو جسمانی، ذہنی، علمی اور جنگی لحاظ سے کمزور اور بے بس کر دیا ہے۔

اب ذرا سنئے کہ محمد اسد صاحب صلیبی جنگوں کے حوالے سے مزید کیا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

''صلیبی جنگوں کے زمانے میں ہی یہ مضحکہ خیز تصور کہ اسلام ایک غیر مہذب، نفسانیت پرست اور وحشیانہ تشدد کا مذہب ہے اور اس میں سوائے رسومات کی ادائیگی کے دل کی پاکیزگی کے لئے کوئی اعمال نہیں ہیں۔ یہ غلط تصور مغربی ذہن میں اس وقت سے بیٹھا دیا گیا ہے۔ اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنھوں نے بار بار اپنے ماننے والوں پر زور دیا کہ وہ دوسرے مذاہب کے انبیاء کی برابر عزت کریں انہی کا نام نفرت اور تعصب کی بنا پر یورپی لٹریچر اور تقاریر میں محمد کی بجائے ''مہاونڈ'' رکھا گیا۔ اور اس وقت سے یہ تعصب کبھی کتب کے ذریعہ، کبھی کارٹون کے ذریعہ اور کبھی فلم میڈیا کے ذریعہ بار بار منظر عام پر آتا ہے۔'' ان اقتباسات کے ذریعہ میں آپ کی توجہ دو باتوں کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ صلیبی جنگوں میں مسلمان جرنیلوں کا کیا کردار رہا جس کی تاریخی مثال صلاح الدین ایوبی ہیں۔ مغربی تاریخدان اب تک ان کو Saladin the Great کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے صحیح اسلامی روایات کے تحت ان جنگوں کے بعد عیسائیوں اور یہودیوں سے درگذر سے کام لیا اور ان سے امن اور رواداری کے تعلقات قائم کئے۔ لیکن عیسائی اقوام نے صلیبی جنگوں میں جو ہزیمت اٹھائی تھی وہ زخم کبھی مندمل نہ ہو سکا۔ اور نت نئی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں مات دینے کی کوشش جاری رہی۔ دوسری بات جس کی طرف میں آپ کی خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ زندہ قومیں صحیح تجزیہ اور اس کے مطابق لائحہ عمل طے کرتی ہیں۔ جو جماعت یا قوم اس طریق کو نہیں اپناتی اس کے منصوبہ کتنے ہی اعلیٰ ہوں، جذبہ کتنا ہی سچا ہو، وہ ترقی کی منزلیں کبھی طے نہیں کر سکتی۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جنگ عظیم اول کے بعد جب سلطنت عثمانیہ نے جو سعودیہ عرب تک پھیلی ہوئی تھی اس نے اتحادی ملکوں کی بجائے جرمنی کا ساتھ دیا اور جب جرمنی کو شکست ہوگئی تو انگلستان، فرانس اور دیگر اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس انتہائی نازک وقت پر بجائے اس کے کہ عرب دنیا اور دوسری مسلمان حکومتیں سر جوڑ کر بیٹھتے اور حالات کے پیش نظر ایسا لائحہ عمل تیار کرتے جس میں اتحادی اقوام سے براہ راست تصادم کی بجائے دیگر موثر ذرائع اختیار کئے جاتے۔ جن پر اس وقت کے حالات میں موثر انداز سے عمل ہو سکتا تھا اور ملت اسلامیہ کو ذہنی کرب اور انتشار سے نکال کر مثبت انداز میں تعمیر نو کرنے کے قابل بنایا جاتا۔ لیکن اتحادیوں نے عرب دنیا میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر کے ان کو منتشر کر دیا۔ دوسری طرف ہندوستان کے مسلمانوں نے جن کے دلوں میں ملت اسلامیہ کا درد حد درجہ موجود تھا اور وہ دینی علوم اور اتحاد بین المسلمین کے ہراول دستہ کے طور پر ہر وقت تیار ہو جاتے تھے۔ انہوں نے بھی کسی مثبت انداز میں کوئی منصوبہ بندی کرنے کی بجائے غیر ضروری جذبات کا مظاہرہ کیا۔ اور سلطنت عثمانیہ جو جنگ عظیم اول کے بعد خود ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اور اتحادی ممالک اس کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ آپس میں طے کر چکے تھے۔ اس کو بچانے کے لئے تحریک خلافت چلائی اور ہندوستان میں رہ کر کوئی موثر تحریک چلانے کی بجائے ملک چھوڑ کر افغانستان ہجرت کرنے کو ہی اتحادی قوتوں پر دباؤ ڈالنے کا موثر طریق سمجھا جو بری طرح ناکام ہوا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت انگریزوں کی نظروں مین اور زیادہ کھٹکنے لگی۔ اور مسلمانوں کو اس تحریک کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مالی اور سیاسی نقصان پہنچا۔

اس مرحلہ پر عیسائی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ جن کی اسلام اور تاریخ اسلام پر کتابیں اس وقت مغرب میں سب سے زیادہ پڑھی جانی والی کتب میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کتب میں انہوں نے نہ صرف اسلامی تعلیمات کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے بلکہ اسلامی تاریخ کی اوائل کی تاریخ اور اب تک کے تاریخی واقعات پر کافی حد تک غیر متعصبانہ تجزیہ بھی کیا ہے۔ گو بعض جگہ تاریخی واقعات جو غلط رنگ میں خود ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں ان کی بنا پر اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے رویوں پر تنقید بھی کی ہے۔

یہ عیسائی مصنفہ اپنی کتاب ''اسلام کی مختصر تاریخ'' میں Fundamentalism یعنی بنیاد پرستی کے متعلق کس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں وہ سنئے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کے صفحہ 140 پر وہ لکھتی ہیں:

''کہ مسلمانوں کی طرف سے تصادم اور بعض اوقات مذہبی تشدد پسندی کے واقعات کو اکثر مغربی ذرائع ابلاغ یا میڈیا خالصتاً اسلامی سوچ اور رویہ کو بنیاد پرستی کے مظہر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ بات اس طرح پر ہرگز نہیں ہے۔ بنیاد پرستی پوری دنیا میں انسانی تاریخ کی ایک حقیقت ہے اور تمام بڑے مذاہب میں مختلف ادوار میں جدید سماجی اور معاشی ترقی کے ردعمل کے طور پر یہ رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کا مذہبی رجحان پہلی دفعہ عیسائیت میں امریکہ میں بیسویں صدی میں پیدا ہوا۔ بنیاد پرستی یا Fundamentalism خود ایک مذہب میں اپنے طور پر بھی پیدا

ہو جاتا ہے اور اس کی اپنی وجوہات اور علامات ہوتی ہیں۔لیکن اس کے مظاہرہ کا رنگ تقریباً ایک ہی طریق پر ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بنیاد پرستی کی موجودہ تحریک یکدم مغرب کی جدید پرستی کے ردعمل کے طور پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ زور پکڑتی گئی۔اور یہ اس وقت شدت اختیار کر لیتی ہے جب کہ معاشرہ میں جدیدیت یا Modernism خواہ وہ تہذیبی ہو یا مادی کافی حد تک بڑھ چکتی ہے اور جس کی وجہ سے معاشرہ مختلف قسم کے اخلاقی اور سماجی مسائل کا شکار ہونے لگتا ہے۔ پہلے تو مذہبی لوگ اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ مروجہ سوچ، روش اور تمدنی خدوخال کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کرتی ہیں اور جیسے کہ ہم جانتے ہیں کہ مسلمان مصلحین نے گذشتہ صدیوں میں اس طریق پر کافی کام کیا۔لیکن ایسے اعتدال پسند اقدامات زیادہ منظم نہ تھے اور اس لئے وہ دیرپا اثرات مرتب نہ کر سکے اور ان میں سے بعض لوگوں یا گروہوں نے زیادہ انتہائی قدم اٹھانے شروع کئے اور اس طرح یہ بنیاد پرست تحریکیں معرض وجود میں آئیں۔"

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی سورت آل عمران آیت 138 تا 143 میں دنیا میں غلبہ حاصل کرنے کا جو طریق بتاتا ہے اس میں صبر اور ایمان کا عنصر بنیادی شرط ہے اور پھر چند اور آیات میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان الفاظ میں تنبیہہ کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی نعمت چھین لیتا ہے تو اس کی وجہ دوسروں کی دشمنی سے زیادہ تمہاری اپنی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے تم اپنی اہلیت کو کھو بیٹھتے ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سورت انفال آیت 53 میں فرماتا ہے:

ذلک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم و ان اللہ سمیع علیم ۔

"یہ اس لئے کہ اللہ کبھی کسی کی نعمت کو نہیں بدلتا جو اس نے کسی قوم پر کی ہو جب تک کہ وہ خود اپنی حالتوں کو نہ بدلیں۔اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے آج سے سو سال قبل مسلمانوں کو تشدد کے رویہ اور اس طریق پر جذبہ ایمانی کے اظہار کو جہاد کا نام دینے کے خلاف بھرپور انداز میں آواز اٹھائی۔ کیونکہ اس طرح اسلام کی بدنامی ہوتی ہے اور پھر بار بار اپنی متعدد کتب اور تقاریر میں اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی۔

آپ کی کتاب "گورنمنٹ انگریزی اور جہاد" جو 22 مئی 1900ء میں شائع ہوئی۔اس میں آپ اس بارے میں فرماتے ہیں:

"نادانوں نے جہاد کا نام سن لیا ہے اور پھر اس بہانے سے اپنی نفسانی اغراض کو پورا کرنا چاہا ہے یا محض دیوانگی کے طور پر خونریزی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو اسلام نے خدائی حکم سے تلوار اٹھائی وہ اس وقت اٹھائی گئی کہ جب بہت سے مسلمان کافروں کی تلواروں سے قبروں میں پہنچ گئے۔ آخر خدا کی غیرت نے چاہا کہ جو لوگ تلواروں سے ہلاک کرتے ہیں وہ تلواروں سے ہی مارے جائیں۔ خدا بڑا رحیم و کریم اور حلیم ہے اور بڑا برداشت کرنے والا ہے لیکن آخر کار غیرت مند بھی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ جبکہ اس زمانہ میں کوئی شخص مسلمانوں کو مذہب کے لئے قتل نہیں کرتا تو وہ کس حکم سے ناکردہ لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ کیوں ان کے مولوی ان بے جا حرکتوں سے جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے ان کو منع نہیں کرتے" (ص 13)۔

پھر اسی کتاب میں ایک اور مقام پر حضرت اقدس فرماتے ہیں:

"جو شخص آنکھیں رکھتا ہے اور حدیثوں کو پڑھتا ہے اور قرآن کریم کو دیکھتا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریق جہاد جس پر اس زمانہ کے اکثر وحشی کاربند ہو رہے ہیں۔ یہ اسلامی جہاد نہیں ہے بلکہ یہ نفس امارہ کے جوشوں سے یا بہشت کی طمع خام سے ناجائز حرکات ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں خود سبقت کر کے ہرگز تلوار نہیں اٹھائی بلکہ ایک زمانہ دراز تک کفار کے ہاتھ سے دکھ اٹھایا اور اس قدر صبر کیا جو ہر انسان کا کام نہیں۔ اور ایسا ہی آپؐ کے اصحاب بھی اسی اعلیٰ اصول کے پابند رہے۔ اور جیسا کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ دکھ اٹھاؤ اور صبر کرو ایسا ہی انہوں نے صدق اور صبر دکھایا۔ وہ پیروں کے نیچے کچلے گئے انہوں نے دم نہ مارا۔ ان کے بچے ان کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ وہ آگ اور پانی کے ذریعہ سے عذاب دئے گئے مگر وہ شر کے مقابلہ سے ایسے باز رہے کہ گویا وہ شیر خوار بچے ہوں۔"

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

"ہمارے سید و مولیٰ اور آپؐ کے صحابہ کا یہ صبر کسی مجبوری سے نہ تھا بلکہ اس صبر کے زمانہ میں بھی آپؐ کے جانثار صحابہ کے وہی ہاتھ اور بازو تھے جو جہاد کے بعد انہوں نے دکھائے۔ اور بسا اوقات ایک ہزار جوانوں نے مخالف کے ایک لاکھ نبرد آزما سپاہی کو شکست دے دی۔ ایسا ہوا تا لوگوں کو معلوم ہو کہ جو مکہ میں دشمنوں کی خونریزی پر صبر کیا گیا تھا۔ اس کا باعث کوئی بزدلی اور کمزوری نہ تھی بلکہ خدا کا حکم سن کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور بکریوں اور بھیڑوں کی طرح ذبح ہونے کو تیار ہو گئے تھے۔" (ص ۱۰)

قرآن مجید قوموں کے عروج و زوال کا قانون ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وا ما بانفسھم۔ یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں (رعد ۱۳:۱۱)۔ اپنی کمزوریوں کا احساس نہ کرنا اور دوسروں کو الزام دینا اس سے تو کوئی اصلاح کی راہ نہیں نکل سکتی۔ ہم اس بات کو تو فخر سے کہتے ہیں کہ یورپ نے مسلمانوں کی کتابوں کے تراجم کے ذریعہ علم

حاصل کیا لیکن اس سے آگے بھی تو چلئے کہ ان علوم کو پھر انہوں نے تحقیق اور محنت شاقہ سے کس قدر آگے بڑھایا اور آج ہم ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیا انہی علوم کو جو ہمارا بیش قیمت سرمایہ تھا جسے ہم نے یونان سے لے کر غیر معمولی ترقی دی پھر ہم اس ترقی کی راہ سے کیوں بھٹک گئے؟ اسی اہم نقطہ کی طرف سورت رعد کی آیت نمبر ۱۱ ہماری توجہ دلا رہی ہے اور پھر اسی حقیقت کو قرآن مجید نے ایک دوسرے پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے:

”کہ اللہ کبھی کسی نعمت کو نہیں بدلتا جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو۔ جب تک کہ وہ خود اپنی حالتوں کو نہ بدل لیں۔“ (انفال ۸:۵۳) پھر سورت آل عمران آیت نمبر ۱۴۰ میں ان وجوہات میں سے ایک وجہ ظلم بیان کی ہے جو ان سے ان کی عزت اور ترقی کے تمام ذرائع چھین لیتی ہے اور حکومت کو لے کر دوسری قوم کو دے دیتی ہے اسی حقیقت کو قرآن مجید نے ”نعمتوں کو بدل بدل کر“ دینا کہا ہے:

”ان دنوں کو ہم لوگوں میں بدل بدل کر لاتے رہتے ہیں تا کہ اللہ ان کو جان لے جو ایمان لائے۔“ قرآن مجید ہمیں آگاہ کر رہا ہے کہ ظلم کا جو بھی مرتکب ہوگا۔ وہ حکومت اور عظمت کی نعمتوں سے محروم ہو جائے گا۔ اور تاریخ کے صفحات میں بھی یہی حقیقت واقعاتی رنگ میں موجود ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک مغربی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ کی کتاب سے بنیاد پرستی کے متعلق ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کیا تھا اور یہ کہ ہر بڑے مذہب میں کیوں ایسی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ اب میں اسی کتاب میں سے صلح حدیبیہ کے متعلق اس کے تاثرات کا ذکر کروں گا کہ رسول اکرم صلعم کی عملی زندگی نے تاریخ میں کتنے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں جن کو مخالفین بھی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہم آپؐ کے اسوۃ حسنہ کا ذکر تو بار بار کرتے ہیں لیکن اس سے اپنی زندگیوں میں رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔

عیسائی مصنفہ اس بارے میں لکھتی ہیں:

”صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لئے ایک اور انقلابی موڑ ثابت ہوا۔۔۔ اور اسلام میں حلقہ بگوش ہونے کی رو کو روکنا مشکل ہوگیا۔ بالآخر 630ء میں جب قریش نے رسول اکرم صلعم کے ایک اتحادی قبیلہ پر حملہ کر کے صلح کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو محمد صلعم نے 10 ہزار کی فوج سے مکہ پر چڑھائی کر دی۔ کسی ایک قریش کو بھی اس بات پر مجبور نہ کیا گیا کہ وہ اسلام قبول کرے۔ محمدؐ کی فتح سے ان کے بڑے بڑے مخالفین کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان کا قدیم مذہب ناکام ہو چکا ہے۔ اور اس کے ذریعہ محمدؐ کی سربراہی میں عرب جو باہم خانہ جنگیوں کی وجہ سے بدامنی اور ابتری کا شکار تھے۔ ان میں امن قائم ہو گیا“ (ص ص 19، 20)۔

یہی عیسائی مصنفہ اپنی ایک اور کتاب Muhammad-A Prophet for our Time یعنی ”محمد صلعم، زمانہ حال کے پیغمبر“۔ جو پہلی مذکورہ کتاب کے پانچ سال بعد یعنی 2006ء میں لکھی گئی۔ اس میں مغربی دنیا میں رسول اکرمؐ کے متعلق ان انتہائی گندے خیالات کا ذکر بھی کرتی ہیں جو مغربی ذہنوں میں بٹھائے گئے ہیں کہ اسلام ایک تشدد پسند مذہب ہے اور محمد صلعم نے ان لوگوں پر اس کا نفاذ تلوار سے کیا جو اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

اس مصنفہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ بعض انتہا پسند مسلمان اپنے متشدد نظریات اور اعمال کی بنیاد کو محمدؐ کی زندگی پر رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔ مغربی تہذیب میں اسلام کے خلاف جنونی نوعیت کا تعصب صلیبی جنگوں کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ نبی اکرمؐ کی زندگی کے متعلق یہ مسخ شدہ تصویر مغرب میں عام طور پر ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے اور ان کو کافی دقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ محمدؐ کی زندگی کے متعلق حقیقت پسندانہ رنگ میں مطالعہ کریں۔ 11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکہ کے دایں بازو کی عیسائی تنظیموں اور مغربی میڈیا کے بعض حلقوں نے مخالفت کی اس روایت کو جاری رکھا ہوا ہے کہ محمدؐ ہمیشہ سے جنگی جنون کے عادی تھے اور کچھ تو اس حد تک چلے گئے ہیں کہ محمدؐ (نعوذ باللہ) ایک تخریب کار اور (نعوذ باللہ) 'بچوں کا شغل' رکھتے تھے۔“

لیکن آخر میں وہ مصنفہ لکھتی ہیں: ”لیکن اب ہم اس قسم کی عریاں تعصب کی باتیں کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ایسے اعتراضات انتہا پسند لوگوں کے لئے ایک سنہری موقع فراہم کرتے ہیں کیونکہ اس قسم کے بیانات کو وہ اسباب کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ مغربی دنیا ایک نئے صلیبی جنگ کا ساماں پیدا کر رہا ہے۔ محمدؐ ایک متشدد شخص ہرگز نہ تھے۔ ہمیں ان کی زندگی کے بارے میں ایک متوازن رویہ اپنانا چاہیے تا کہ انکے کارناموں اور کامیابیوں کو صحیح رنگ میں مطالعہ کر سکیں اور ان کی حقیقت کو سمجھیں جو ہر لحاظ سے تعریف کی مستحق ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ موجودہ متعصب رویہ مغربی تہذیب کی رواداری، آزاد خیالی اور ہمدردی کی خصوصیات کے دعویٰ کو نقصان پہنچانے کا موجب ہو رہا ہے“ (ص ص ۱۱،۱۲)۔

تحریک احمدیہ لاہور کو اسلام کے بارے میں کتب کو مغربی حلقوں کو پہلے سے زیادہ کوشش سے پہنچانی چاہیں اور نئے اعتراضات کے جوابات اور موجودہ وسائل کو استعمال کر کے اسلام کے دفاع کے کام کو زیادہ موثر بنانا چاہیے تا کہ مغرب میں اسلام اور بانی اسلامؐ کے خلاف پراپیگنڈا کا مثبت انداز میں رد کیا جا سکے۔

☆☆☆☆

حضرت بابا گرونانک جی کے سفر۔۲

سید افضل حیدر، سینئر ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ آف پاکستان

تیسری سیاحت

تیسری سیاحت شمالی جانب کی جو ''سدھ مٹھو'' کی سیاحت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی مدت باقی تمام سیاحتوں سے کم ہے یہ 1515ء سے 1517ء تک یعنی صرف دو سال میں ختم ہوگئی۔ اس میں آپ کرتار پور سے روانہ ہوکر جموں کشمیر، کوہ شوالک، سرمور، گڑھوال، بدری ناتھ، پریم کنڈ، پوری شہر، تبت، بھوٹان اور نیپال وغیرہ کا دورہ کر کے واپس کرتار پور پہنچے۔ تمام پہاڑی علاقے ''جوگیوں'' اور ''سدھوں'' کے مراقبوں کے مراکز ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اس وقت ''جوگ مت'' کا دور دورہ تھا۔ ملک کے نوجوان ''جوگ مت'' کے زیر اثر اپنا گھر گھاٹ چھوڑ کر ''سدھوں'' کے مقامات پر چلے جاتے تھے۔ بھائی گورو داس نے جوگیوں کے اس عمل کو اپنی ''واروں'' میں دنیا کے ڈوبنے کا باعث بتایا ہے۔

اس سیاحت کو جنم ساکھی میں سمیر پربت کی ''اداسی'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''ساکھی'' میں لکھا ہے کہ جب گرو صاحب سدھوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے آپ کو مدیعنی شراب کا پیالہ پینے کو کہا۔ ''جوگی'' مراقبہ (سادھی) کی تکمیل کے لئے ایک ہی پیالہ سے شراب پیا کرتے تھے تاکہ وہ سب حالت نشہ میں یکسوئی کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھیں اور ''ان حد شبد'' سن سکیں۔ اس طرح ''جوگی'' اور ''سدھو''، ''ہٹھ جوگ'' کے ذریعہ سخت جسمانی ریاضت کر کے ''ان حد شبد'' سننے کے لئے خود کو تیار کرتے تھے۔ ''جنم ساکھی'' کے مندرجہ ذیل الفاظ اس گفتگو کو پیش کرتے ہیں:

''تب سدھاں آکھیاں، ایہہ سادھاں کا پیالہ ہے توں
پیو۔'' ''تب بابے آکھیا اس وچ کیا پائیا؟
تب سدھاں آکھیا، اس وچ گڑ اتے دھاوے
کے پھل پائے ہیں، تب بابا بولیا۔

اس سیاحت کو گرو صاحب نے سدھوں کے ساتھ سوال و جواب کی صورت میں ''سدھو گوشٹ'' کے عنوان سے ایک طویل بانی ''راگ رام کلی'' میں فرمائی۔ یہ تخلیق 73 بند پر مشتمل ہے۔ اس میں جوگ کے نظریات کی مفصل وضاحت کی گئی ہے۔ گرو صاحب نے جوگیوں کی طرف سے خود ہی سوالات کر کے خود ہی واشگاف الفاظ میں ان کے جواب دیئے ہیں۔ ادبی نکتہ نگاہ سے یہ ایک فلسفانہ نظم ہے۔ جس میں عقل اور تدبر کی برتری ہے۔

چوتھی سیاحت

آپ کی چوتھی سیاحت مغربی ممالک کی جانب بیان ہوتی ہے۔ روانگی کے وقت آپ نے نیلے رنگ کا لباس پہنا۔ ہاتھ میں عصا پکڑا، بغل میں کتاب دبائی اور دوش پر مصلہ اٹھایا۔ گویا بالکل اسلامی وضع قطع بنا کر چلے۔ یہ سیاحت پانچ برس پر مشتمل ہے۔ اس میں آپ کرتار پور سے روانہ ہوکر شرق پور، رہتاس اور ڈیرہ غازی خان وغیرہ ہوتے ہوئے براستہ سندھ عازمین حج کے ہمراہ مکہ پہنچے۔ مکہ، مدینہ، بغداد، یروشلم، دمشق، مصر، ترکی، ایران، قندھار اور افغانستان سے ہوتے ہوئے براستہ کابل اٹک دریا پار کر کے حسن ابدال (پنجہ صاحب) ہوکر 1521ء میں واپس کرتار پور آئے۔ بغداد میں بابا نانک کی یادگار بھی بیان ہوتی ہے۔ آپ کی ملاقات بہلول داتا سے بھی ہوئی تھی۔

مکہ کے واقعہ کو بھائی گورو داس نے پہلی وار کی 33 ویں پوڑی میں بیان کیا ہے۔ مکہ کے حاجیوں اور قاضیوں نے یہ پہچان لیا تھا کہ آپ جنم سے ہندو ہیں۔ اس لئے ان کا بڑا سوال جس کا وہ جواب طلب کرتے تھے یہ تھا کہ ہندو دھرم اور مذہب اسلام دونوں میں سے کون سا مسلک بہتر اور اعلیٰ ہے۔ گرو صاحب کا جواب یہ تھا۔

''بابا آکھے حاجیاں شبھ عملاں باجھوں دونویں روئی
ہندو مسلمان دوئے درگہ اندر لین نہ ڈھوئی
(وار گورو داس جی)

ترجمہ: بابا جی نے فرمایا اے حاجیو اچھے اعمال کے بغیر دونوں روتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں کا مالک کی درگاہ میں قبولیت نہیں۔ قبولیت تو صرف اعمال کی ہے۔

مغرب کی سیاحت میں آپ نے اسلامی نظریات وروایات کے پیش نظر لوگوں کو راہ راست کی پابندی کا درس دیا۔ آپ کی شاعری اور موسیقی نے شریعت پرستوں میں نیک اعمال کا جذبہ پیدا اور بیدار کیا۔

ان سیاحتوں میں بابا نانک کو مختلف افراد اور گروہوں سے آمنا سامنا ہوا۔ ذیل میں ہم اس کی سرسری سی تفصیل پیش کر رہے ہیں۔

جنگلوں بیابانوں سے گزرتے ہوئے نانک نے مردانا کے ساتھ پنجاب کے جنوب مغرب کی طرف کافی دور تک سفر کیا۔ لیکن کسی بھی جگہ پر آپ نے قیام نہ کیا۔ جب بھی راستے میں کوئی آبادی آتی تو آپ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے۔ وہ جنگلی

بیروں یا پھلوں سے اپنی بھوک مٹاتے۔ لیکن مردانا نے شکایت کی کہ نانک اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر رہا جیسا درویش لوگ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ گرونانک نے اسے سمجھایا کہ اگر کوئی شخص خدا کی طرف جانے والے راستہ کا اپنے لئے انتخاب کرتا ہے تو اسے مخلوق سے کسی خیرات کی توقع کرنے کی بجائے اپنے کھانے کی خود فکر کرنی چاہیے۔

لیکن مردانا کو اپنے راہبر کی دانائی اور حکمت پر کامل یقین نہ ہوا۔ ایک دن نانک نے مردانا کو ایک آبادی میں جانے کی اجازت دے دی۔ جب گاؤں میں یہ خبر پھیلی کہ ایک درویش وہاں آیا ہے تو وہاں کے تمام مرد اور عورتیں اس کے گرد اکٹھے ہوگئے اور اس سے دعاؤں کی درخواست کی۔ مردانا نے ان لوگوں کے لئے نہایت خلوص سے دعا کی۔ گاؤں والے اس کے لئے نہ صرف انواع واقسام کے لذیذ کھانے لے کر آئے بلکہ انہوں نے اسے ریشمی، اونی اور سوتی کپڑوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی خوشبوئیں بھی دیں۔ مردانا جلدی جلدی تمام چیزیں لے کر انتہائی خوشی کے ساتھ جنگل میں اپنے گرو کے پاس آ گیا۔ جب نانک نے اپنے ساتھی کو اتنے سارے تحائف کے ساتھ دیکھا تو آپ مسکرائے اور پوچھا کہ ''تم نے میری حکم عدولی کیوں کی ہے؟'' مردانا نے مضطرب ہو کر کہا کہ ''وہ اپنے عقیدت مندوں کو مایوس نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اسے یہ تمام تحائف قبول کرنے پڑے۔'' نانک نے اسے کہا کہ یہ سب چیزیں پھینک دے۔ بادل نخواستہ مردانا کو ایسا کرنا پڑا۔ پھر مردانا نے نانک سے پوچھا: ''کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ یہ چیزیں اپنے پاس آنے والے ضرورت مند لوگوں کو دے دیں۔ ایسا کرنے سے خدا بھی خوش ہوگا۔'' نانک نے جواب دیا: ''ہاں یہ درست ہے کہ بھوکے کو کھانا کھلانے اور بے لباس کا تن ڈھانپنے والے پر خدا رحم کرتا ہے لیکن دینے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنی جائز کمائی میں سے خیرات دے۔'' نانک نے مزید کہا کہ ''اور لینے والے کے لئے بھی ضروری ہے کہ صرف اپنی ضروریات کے مطابق ہی لے۔''

سفر کے دوران انہیں ایک درویش کے بھیس میں 'سجن' نام کا ایک ٹھگ ملا۔ ہاتھ میں تسبیح پکڑے وہ سڑک کنارے بیٹھا تھا۔ اس کی چالاک آنکھیں کبھی کبھار آنے جانے والوں کو دیکھنے کے لئے کھلتی تھیں۔ اس نے ایک شیخ مسلمان کا روپ دھار کر نہ صرف ایک مسجد بنائی تھی بلکہ ہندوؤں کے لئے ایک مندر بھی تعمیر کیا تھا تاکہ وہ ہر مسافر کی اس کے دین دھرم کے مطابق سیوا کرنے کا ڈھونگ رچا سکے۔ وہ پہلے تو اپنے مہمان کی خوب خاطر تواضع کرتا اور پھر نصف شب کے وقت اس کا تمام مال اسباب لوٹنے کے بعد اسے قتل کرتا اور لاش قریبی کنویں میں پھینک دیتا۔ صبح ہونے پر وہ دوبارہ سڑک کے کنارے تسبیح کے منکے پھیرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اگلے شکار کا انتظار کرنے لگتا۔

جب اس نے گرونانک کو آتے دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے کہا ''اس کے ساتھ نہایت گرمجوشی کا مظاہرہ کرنا یہ کافی امیر شخص لگتا ہے۔ اس کا چہرہ امارت سے دمک رہا ہے۔'' ٹھگ کے ساتھیوں نے ایسا ہی کیا۔ جب رات ہوئی تو ٹھگ نے گرونانک سے کہا کہ اب وہ سو جائیں۔ لیکن نانک نے جواب دیا وہ خدا کی شان میں ایک حمد گانے کے بعد بستر پر لیٹینگے۔ سب لوگ وہاں جمع ہوگئے اور سجن نانک جی کے سامنے بیٹھ گیا۔ تو مردانا نے اپنا رباب نکالا اور اپنی تجربہ کار انگلیوں سے اسے بجاتے ہوئے ''راگ سوہی'' کی دھن چھیڑی، پھر نانک جی نے یوں گانا شروع کیا:

''کانسی کا برتن نہایت شاندار انداز سے چمکتا ہے لیکن تم اسے رگڑو تو اس کی اندرونی تہہ آشکار ہو جائے گی۔ جو لوگ ہمیں اپنا دوست کہہ رہے ہیں حقیقت میں وہ اس وقت تک ہمارے دوست نہیں جب تک وہ ہمارے ساتھ خدا کے دربار میں نہ کھڑے ہو جائیں، جہاں ہمارے تمام حساب برابر ہوتے ہیں۔ اگر کسی کھنڈر کو پلستر کر دیا جائے یا اس کی آرائش بھی کر دی جائے تو بھی اس کی کیا قدر ہے۔ بگلے بھی سادھوؤں کی طرح دریاؤں کے کنارے پر رہتے ہیں لیکن ہمیشہ ان کی آنکھیں کبھی ختم نہ ہونے والی اپنی طمع کے شکاروں پر لگی رہتی ہے۔ اندرائیں کا درخت پتوں، پھولوں اور پھلوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کے پھلوں کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ پھولوں کی کوئی خوشبو نہیں ہوتی اور پتوں کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔

''ایک اندھا شخص اپنے سر پر گٹھڑی اٹھائے پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ وہ بہت دور تک عمودی چڑھائی چڑھتا ہے لیکن بغیر بینائی کے وہ بلندیوں کی پیمائش کیسے کر سکتا ہے؟ اے نانک ہماری ہوشیاری اور ہماری جھوٹ موٹ کی پارسائی کسی کام کی نہیں ہے۔ محض خدا کی محبت ہی میں ہماری نجات ہے اور اس کے باعث ہی ہم اپنے پاؤں کی زنجیروں سے رہائی پاتے ہیں۔''

جب ''سجن'' نے نانک جی سے یہ دلگداز شلوک سنے تو اس کے اندر بے چینی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کی روح بیدار ہوگئی اور وہ اپنے تاریک ماضی پر انتہائی شرمسار ہوا اور نانک کے پاؤں کو گرم جوشی سے سینے سے لگایا اور زاروقطار روتے

(بقیہ صفحہ 26 پر)

مکہ کے واقعہ کو بھائی گورداس نے پہلی وار کی 33ویں پوڑی میں بیان کیا ہے۔ مکہ کے حاجیوں اور قاضیوں نے یہ پہچان لیا تھا کہ آپ جنم سے ہندو ہیں۔ اس لئے ان کا بڑا سوال جس کا وہ جواب طلب کرتے تھے یہ تھا کہ ہندو دھرم اور مذہب اسلام دونوں میں سے کون سا مسلک بہتر اور اعلیٰ ہے۔ گرو صاحب کا جواب یہ تھا۔

''بابا آکھے حاجیاں شبھ عملاں باجھوں دونویں روئی
ہندو مسلمان دوئے درگہ اندر لین نہ ڈھوئی
(وار گورو داس جی)

ترجمہ: بابا جی نے فرمایا اے حاجیو اچھے اعمال کے بغیر دونوں روتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں کا مالک کی درگاہ میں قبولیت نہیں۔ قبولیت تو صرف اعمال کی ہے۔

ایک معروف پس پردہ شخصیت کا تعارف

پیام شاہجہانپوری

ایک محقق۔تاریخ دان،مصنف،شاعر،بے باک صحافی اور ندرت طرز تحریر کا خالق کالم نگار

از محمد رضی الدین خاں

(پیام صاحب سے ہماری شناسائی اس زمانے میں پہلی دفعہ ہوئی جب انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یکے بعد دیگرے کئی تحقیقی کتب تصنیف کیں مثلاً "مسیحؑ کا سفر زندگی۔مقام مسیحؑ ۔مسیحؑ کی گمشدہ زندگی۔مسیحؑ کی گمشدہ انجیل وغیرہ ۔آخر الذکر کتاب جس کو انہوں نے ہندی انجیل کا نام بھی دیا۔حضرت مسیحؑ کی زندگی کے بارے میں تحقیقی کام میں اولیت کا مقام رکھتی ہے۔صرف اسی حوالے سے ہم ان کی زندگی کے حالات اور قلمی اور تحقیقی کارناموں کو قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ادارہ)

محترم محمد یمین خان صاحب کا تخلص پیام اور قلمی نام پیامِ شاہجہانپوری تھا۔ لوگوں میں وہ پیام شاہجہانپوری کے نام سے معروف تھے۔وہ اپنی تصانیف،مضامین، نظموں اور غزلوں میں اسی قلمی نام کو استعمال کرتے تھے۔

پیام شاہجہانپوری صاحب شاہجہانپور کے پٹھان جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔آپ کے اجداد کا تعلق صوبہ سرحد کے گاؤں پِیّہ بابوزئی ضلع مردان سے تھا۔جو ایمن زئی قبیلے کے بہت سے جنگجو گھرانوں کے ہمراہ شاہجہاں بادشاہ کے عہدِ حکومت میں پِیّہ بابوزئی سے شاہجہانپور منتقل ہو گئے تھے۔

شاہجہانپور کی بنیاد اور شاہجہاں پور نقل مکانی کا تاریخی پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ شاہجہانپور کی بنیاد شاہجہاں بادشاہ کے عہد حکومت میں 1626ء میں رکھی گئی۔ یہ تمام علاقہ وسیع جنگلات پر مشتمل تھا۔ان جنگلات اور شاہجہان پور کے گردونواح میں چھوٹے چھوٹے دیہات میں مختلف ہندو قوموں کے لوگ آباد تھے جن میں گوجر، باچھل،مرہٹے اور اہیر وغیرہ تھے۔

ان قوموں کے اکثر لوگ قتل وغارت اور لوٹ مار سے وابستہ تھے۔نتیجتاً شاہجہانپور شہر پر آئے دن یہ لوگ حملہ آور ہوتے،قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر کے یہ لوگ واپس جنگلات میں چلے جاتے۔جب شاہی فوج ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے آتی تو یہ لٹیرے جنگلات کا رُخ کرتے اور اپنی کمین گاہوں میں جا چھپتے یا پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اور شاہی فوج کی واپسی کے بعد قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار پھر گرم ہو جاتا۔مغل فوجوں اور ان غارت گروں کے درمیان آنکھ مچولی کا یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک چلتا رہا۔ان حالات سے تنگ آکر شاہجہان نے اس علاقے کو مستحکم کرنے اور بدامنی سے پاک کرنے کا حل نکالا اور صوبہ سرحد اور افغانستان سے مختلف پٹھان جنگجو قبائل کو یہاں لا کر آباد کیا۔انھیں جاگیریں دیں اور زر و مال دیا۔اس طرح ایک طویل عرصے کے بعد شاہجہانپور شہر میں امن اور سکون کا دور دورہ شروع ہوا۔

پیام صاحب کے والد محمد امین خاں کے والد اور والدہ بہت کم سنی کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔محمد امین خان صاحب کی کم سنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جب ان کے عزیزوں نے امین خان صاحب کی جاگیر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تو ان کی ساری جاگیر کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دی گئی۔

خاندان کے مخصوص جاگیردارانہ ماحول کے باوجود پیام صاحب کے والد گرامی محمد امین خان صاحب کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔اسی شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے محمد امین خان صاحب نے رائل کالج آف انجینئرنگ،لکھنؤ میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے سول انجینئر کی ڈگری حاصل کی۔اس علمی ماحول میں پیام صاحب نے 7/جولائی 1927ء کو آنکھ کھولی۔علمی ماحول کی وجہ سے پیام صاحب کا علم وادب کی طرف جھکاؤ اور ان کی شخصیت کی بنیاد بننا ایک قدرتی امر تھا۔

پیام صاحب نے چھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا۔قدیم زمانے کے رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی بنیادی تعلیم اتالیق گھر پر ہی دیتے رہے۔اس کے بعد تعلیم کے چند ابتدائی سال مکتب میں گزارے۔

فارسی،عربی،انگلش اور اُردو پر اپنے شوق سے عبور حاصل کیا۔ان علوم کے حصول کے لیے کسی کالج یا اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخل نہیں ہوئے۔

چونکہ پیام صاحب کا جھکاؤ شروع سے ہی شاعری کی طرف تھا اور شاہجہانپور میں جانشین امیر مینائی،اعتبارالملک حضرت دِلؔ شاہجہانپوری کا مبارک وجود تھا۔ پیام صاحب نے جناب دِلؔ شاہجہانپوری کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے اور اس طرح سے پیام صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا اور باقاعدہ مشاعروں میں پڑھنے لگے اور یوں ہندوستان کے طول وعرض میں ہونے والے مشاعروں میں

شرکت کا سلسلہ شروع ہوا۔

دسمبر 1947ء میں پیام صاحب شاہجہانپور سے لاہور منتقل ہو گئے۔ پاکستان آکر پیام صاحب کی ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں نثر کو بنیاد بنا کر تاریخ کی ریسرچ کی انتہائی جانکنی اور مشکل ترین راستے پر گامزن ہوئے اور زندگی کی آخری سانس تک تاریخ کی گم شدہ کڑیاں ملا کر نتائج اخذ کرتے رہے۔

نثر میں تاریخ کی جستجو اور کھوج کے سفر کے ساتھ ساتھ پیام صاحب کا اگلا سفر صحافت کی طرف تھا۔

اس دور میں پیام صاحب نے علمی، ادبی، تاریخی، سماجی اور اسلامی موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ روزنامہ امروز، نوائے وقت، زمیندار، مشرق، آفاق اور کراچی کے جنگ اور امن میں آپ کے تحقیقی اور علمی مقالا جات و مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی رسالوں، ماہنامہ ادبی دنیا، عالم گیر، الحمراء، ہمایوں، نیرنگِ خیال، نقوش، ادبِ لطیف، افکار اور بہت سے دوسرے جرائد میں بھی آپ کا کلام اور علمی و تاریخی موضوعات پر تحقیقی مقالہ جات شائع ہوتے رہے۔ 1950ء سے بہت سے ہفت روزہ اور ماہنامہ پرچوں کی ادارت اور ادارتی بورڈ بطور خاص لاہور کے ماہنامہ معاشرتی بہبود اور گلِ خنداں وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ عرصہ ''باغ و بہار'' سے بھی وابستہ رہے۔

اس طرح 1950ء سے 1954ء تک علمی اور ادبی میدانوں میں بھرپور طریقے سے صحافت کے ذریعے اپنا مقام بنایا۔ چونکہ پیام صاحب کا تعلق پٹھانوں کے ایک جنگجو قبیلے ایمن زئی سے تھا اس لیے سپاہ گری اور شجاعت ان کے خون کا حصہ تھی۔ 1947ء میں پاکستان کی آزادی کے بعد جب حکومت پاکستان کو کشمیر کی آزادی کے لیے قلیل فوج کے ہوتے ہوئے مزید کمک کی ضرورت پڑی تو پیام صاحب نے بھی رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات کشمیر کی آزادی کے لیے پیش کر دیں اور چند مہینے محاذِ کشمیر میں دادِ شجاعت دیتے رہے جس کے صلہ میں حکومت پاکستان کی طرف سے آپ کو تمغۂ خدمت بھی عطا کیا گیا۔ 1954ء میں پیام صاحب انجمن حمائت اسلام، لاہور سے وابستہ ہو گئے اور انجمن کے ہفت روزہ ''حمائت اسلام'' کی ادارت سنبھالی۔ ہفت روزہ ''حمائت اسلام'' کے ساتھ وابستگی یا ادارت کا سفر 18 سال پر محیط ہے۔ 1973ء میں انجمن حمایت اسلام، لاہور سے علیحدہ ہو گئے۔

انجمن حمائت اسلام سے وابستگی کے دوران بھی آپ کا تحقیقی اور علمی سفر جاری رہا۔ انجمن حمائت اسلام نے آپ کی کتب بھی شائع کیں جن میں ''تاریخ نظریہ پاکستان'' اور آپ کی قومی نظموں کا مجموعہ ''شعلہ احساس'' شامل ہیں۔

انجمن حمائتِ اسلام سے علیحدگی کے بعد آپ تقریباً پانچ سال تک ریڈیو پاکستان، لاہور سے وابستہ رہے۔ لیکن یہ وابستگی کسی باقاعدہ ملازمت کی صورت میں نہیں تھی بلکہ سہ ماہی معاہدہ کے تحت فورسز پروگرام میں ہر ہفتہ کی شام آپ کی ایک تقریر نشر ہوتی جس میں خاص طور پر اسلامی فتوحات اور مسلمان سپہ سالاروں کے کارہائے نمایاں کو موضوع بنایا جاتا۔

اس کے علاوہ ان مسلم شخصیتوں کے فکر و فن پر اظہار خیال کرتے جنھوں نے آج سے صدیوں قبل اپنے فلسفے اور سائنسی نظریات سے دنیا میں انقلاب برپا کیا۔

انجمن حمائت اسلام، لاہور سے علیحدگی کے بعد پیام صاحب نے پندرہ روزہ ''تقاضے'' 1980ء میں جاری کیا۔ تقاضے نے مارشل لاء حکومت کی مخالفت اور جمہوریت کی بحالی اور اخلاقی قدروں کی سربلندی کو اپنا نصب العین بنایا۔ ''تقاضے'' کا بھرپور عہد جنرل ضیاء الحق کے عہد کے ساتھ وابستہ تھا۔

یہ ملک کے ان چند جریدوں میں شامل تھا جو نظریات کی بلندی اور قلم کے تقدس کی سربلندی کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دیتے رہے۔ ''تقاضے'' ہمیشہ سرکاری سرپرستی کے داغ سے محفوظ رہا۔ حتیٰ کہ سرکاری اشتہارات جو کہ کسی بھی رسالے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پیام صاحب نے سرکار پرستی سے اس ''تقاضے'' کو اس رنگ میں محفوظ رکھا۔ بلکہ اپنے لاتعداد قارئین کے بل بوتے پر ''تقاضے'' نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ملک کا واحد جریدہ تھا جو انتہائی اعلیٰ علمی اور فکری معیار رکھتے ہوئے بغیر کسی دفتری عملے کے 1980ء یعنی اپنی ابتداء سے لے کر فروری 2005ء یعنی اپنی انتہا تک جاری رہا۔ ''تقاضے'' کا بنیادی مقصد ہی جمہوری قدروں کا فروغ اور ملکی نظام کو مارشل لاء کی غلاظت سے پاک رکھنا تھا۔

''تقاضے'' اشاعت کے آغاز سے ہی ضیاء الحق حکومت کی شدید مخالفت کرتا رہا۔ اس وجہ سے ''تقاضے'' کو ضیاالحق کی فوجی آمریت کی طرف سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ ''تقاضے'' میں شائع ہونے والی حقائق پر مبنی تحریریں جب فوجی حکومت کی برداشت سے باہر ہو گئیں تو ''تقاضے'' کے شماروں کی ضبطی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''تقاضے'' کے شماروں کی ضبطی بھی جب پیام صاحب کے پائے استقلال میں کوئی لغزش پیدا نہ کر سکی تو مارشل لاء حکومت کے اشارے پر پنجاب حکومت کی طرف سے دوسرا خوف ناک حربہ استعمال ہونا شروع ہوا یعنی اب پیام صاحب سے ضمانتیں طلب کرنا شروع کر دی گئیں اور آئے دن دس سے پندرہ ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جانے لگی۔ ''تقاضے'' کے شماروں کی بندش اور بار بار ضمانتوں کی طلبی بھی جب پیام صاحب کو جھکا نہ سکی اور حکومت کی بڑی بڑی مالی ترغیبات کو بھی جب پیام صاحب نے پاؤں کی ٹھوکر پر لکھ دیا تو ضیاء الحق کے اشارے پر پنجاب کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے پندرہ روزہ ''تقاضے'' لاہور کا ڈیکلریشن ہی منسوخ کر دیا۔ اور یوں پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کی دو دھاری تلوار سے ''تقاضے'' کا سر قلم کر دیا گیا۔

اس طرح نومبر 1987ء میں حق گوئی کے جرم کی پاداش میں ''تقاضے'' کو

بندش کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب حکومت کے ذریعے ضیاء الحق حکومت کے اس گھناؤنے اقدام کی ملک کے اخبارات اور جرائد نے بھرپور مخالفت کی اور صحافیوں اور دانشوروں کی طرف سے ''تقاضے'' کی بندش پر شدید احتجاج کیا گیا اور پیام صاحب کی صحافتی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ''تقاضے'' کی بندش کے بعد 1988ء میں ہی سینئر مولانا کوثر نیازی نے سینیٹ میں ''تقاضے'' کی بندش کے خلاف تحریکِ استحقاق پیش کرنا چاہی جسے اس وقت کے سینیٹ کے چیئرمین غلام اسحٰق خان نے اپنے چیمبر میں ہی اسے KILL کر دیا۔

''تقاضے'' نے جو فکری، علمی اور نظریاتی انقلاب برپا کیا، مذہبی رواداری اور مذہبی انتہاپسندی کے خلاف جو علم بلند کیا اس کے ساتھ ساتھ استحصال زدہ طبقے کا جس بھرپور انداز میں ساتھ دیا وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

حکومتِ وقت کی طرف سے ''تقاضے'' کی بندش کے فوراً بعد پیام صاحب نے پندرہ روزہ ''احسان'' شروع کیا جس کی پیشانی پر تقاضے پبلی کیشنز کے حروف لکھے ہوتے۔ پندرہ روزہ ''احسان'' بھی ''تقاضے'' جیسی آن بان کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

1988ء میں جب مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو ''تقاضے'' کا ڈیکلریشن بحال ہوا۔ اس طرح تقاضے نے ایک مرتبہ پھر اپنے بھرپور سفر کا آغاز کر دیا اور ''تقاضے'' ہفت روزہ کی صورت میں شائع ہونا شروع ہوا۔

1989ء میں پیام صاحب نے پندرہ روزہ ''تقاضے'' کو روزنامے کا رنگ دے کر صحافت میں ایک نیا تجربہ کیا کہ کیا دورِ حاضر میں یہ ممکن ہے کہ اخبار کو بھی جرائد کی طرح صاف ستھرے انداز میں شائع کیا جا سکتا ہے۔

وسائل کی کمی کی وجہ سے ''تقاضے'' روزنامہ اخبار کی صورت میں صرف 6 ماہ تک اپنی اشاعت کا تسلسل برقرار رکھ سکا۔ اس طرح روزنامہ ''تقاضے'' ایک تجربے کے بعد فروری 2005ء تک ہفت روزہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ''تقاضے'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ پیام صاحب نے تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا جو مختلف تاریخی موضوعات پر کتابی صورت میں محفوظ ہوتا رہا۔

''تقاضے'' کے علاوہ روزنامہ ''دن'' لاہور میں پیام صاحب نے ''افکار و مشاہدات'' کے مستقل عنوان سے کالم لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو 2000ء سے لے کر مارچ 2005ء تک جاری رہا۔

روزنامہ ''دن'' میں آپ کا آخری کالم آپ کی تدفین کے دن یعنی 17 / مارچ 2005ء کو شائع ہوا۔ دوسرے لفظوں میں پیام صاحب نے زندگی کی آخری سانس تک قلم سے حرمت کا تعلق برقرار رکھا۔

پیام صاحب نے صحافت کے میدان میں ''تقاضے'' کے ذریعے مختصر اداریوں کی صورت میں صحافت کو ایک نیا رنگ دیا۔ یہ مختصر اداریے ''تقاضے'' کی شناخت بن گئے۔ چند سطروں کے ایک اداریے میں معنی کا ایک جہاں آباد ہوتا اور حالاتِ حاضرہ کی بھرپور عکاسی ہوتی تھی یعنی کوزے میں دریا کو بند کرنے کا مختصر اداریوں کی صورت میں ایک نیا، بھرپور اور کامیاب تجربہ کیا۔

پیام صاحب کی تحریروں کا دور ساٹھ سال سے زائد عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی طویل دور میں پیام صاحب اپنی تحریروں اور نظریات کے ذریعے ایک بھرپور روشن خیال اور لبرل معاشرے کی تشکیل میں کوشاں رہے۔ لیکن پیام صاحب اُس روشن خیال معاشرے کے داعی تھے کہ جس میں روشن خیالی اور فکری آزادی اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کے تابع ہو اور جس کی بنیاد توازن پر ہو۔ پیام صاحب کے تعلقات کا دسترخوان انتہائی کشادہ اور وسیع تھا، جس میں ہر مسلک کے لوگ شامل تھے۔ بنیادی طور پر پیام صاحب مذہبی تعصب اور انتہاپسندی کے شدید مخالف تھے جس کا اظہار انھوں نے بھرپور طریقے سے اپنی تحریروں کے ذریعے کیا۔ تعصب چاہے لسانی ہو، مذہبی ہو یا سیاسی ہو گویا کسی بھی رنگ میں ہو تمام عمر اس سے اپنا دامن بچایا۔

پیام صاحب انتہائی روشن خیال اور ایک لبرل سوچ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کی مذہبی بنیاد انتہائی گہری اور ٹھوس تھی۔ ہر سوچ اور فکر کو قرآن پاک کی تعلیم سے اخذ کرتے۔ اس حوالے سے پیام صاحب کی روشن خیالی اور فکری آزادی کلی طور پر قرآن پاک کے تابع تھی۔ پیام صاحب کہا کرتے تھے کہ بے شک میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا لیکن میرے مسلمان ہونے کی وجہ یہ نہیں بلکہ میں نے سالہا سال قرآن پاک کا انتہائی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد اسلام قبول کیا اور ایک طویل عرصہ قرآن پاک کی غور و فکر میں بسر کیا۔

پیام صاحب کی قرآن پاک سے فکری آگہی کی ہی وجہ تھی کہ بہت سے ایسے احباب جو کسی وجہ سے اسلام سے برگشتہ ہو چکے تھے وہ پیام صاحب سے مکالمے کے بعد اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے تھے۔

اس حوالے سے مشہور کیمونسٹ اور لیبر لیڈر ملک فضل الٰہی قربان کی شخصیت کی مثال دی جا سکتی ہے کہ جنھوں نے ماسکو یونیورسٹی سے 1928ء میں سوشیالوجی میں ایم اے کیا اور 1978ء میں وفات پا گئے۔ انتقال سے چند سال پیشتر جب وہ پیام صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے اور پیام صاحب سے کیمونزم اور اسلام کے مابین طویل مکالمے کے بعد یہ بات کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ''خدا کا شکر ہے کہ میں مرنے سے پہلے پیام صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا ہوں''۔

پیام صاحب کی ساٹھ سال سے زائد ادبی زندگی میں ان کی شائع ہونے والی تصانیف کا احاطہ کیا جائے تو چھبیس تصانیف پیام صاحب کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی اور تین مختلف تصانیف پر وہ کام کر رہے تھے۔ ان تصانیف پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ گلے کے کینسر جیسے جان لیوا مرض سے بھی نبرد آزما تھے بلکہ زندگی کے

آخری چند دنوں میں بھی جب کہ پیغامِ اجل کی دستک شروع ہو چکی تھی پیام صاحب نے قلم سے اپنا رشتہ ختم نہیں کیا۔

پیام صاحب کی تصانیف کے علاوہ ایک وسیع تر تحریری کام ہزار ہا صفحات کی صورت میں بکھرا ہوا ہے جو مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے پانچ سال مسلسل فورسز پروگرام میں ہفتہ وار تقاریر کا نشریہ جو کئی کتابوں میں سما سکتا ہے وہ ایک علیحدہ علمی خزانہ ہے۔

فہرست تصانیف

(۱) مقامِ حسینؓ (۲) حیات حسنؓ (۳) عثمانؓ اور خلافتِ عثمانؓ (۴) علیؓ اور ان کی خلافت (۵) عائشہؓ اور خلافت (۶) میخانۂ عجم (فارسی شاعر ''رودکی'' کے عہد سے صفوی دور تک ایرانی ادب کا جائزہ) (۷) جنوبی ہند میں اردو (۸) انیسویں صدی کی اُردو نثر (۹) ہماری تاریخ (۱۰) آفتابِ ہجویرؒ (۱۱) تذکرہ شاہ محمد غوثؒ (۱۲) شہادت گاہِ بالاکوٹ (سید احمدؒ شہید کی تحریک اصلاح و جہاد) (۱۳) حیاتِ نظریۂ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۴) تاریخ نظریۂ پاکستان (۱۵) مسیحؑ کا سفرِ زندگی (۱۶) مقامِ مسیحؑ (۱۷) مسیحؑ کی گم شدہ زندگی (۱۸) مسیحؑ کی گم شدہ انجیل (ہندی انجیل) (۱۹) مسیحؑ کی بن باپ پیدائش (۲۰) شعلۂ احساس (قومی نظمیں) (۲۱) آئینہ (مزاحمتی شاعری) (۲۲) رسولِ کریمؐ (۲۳) اُمِ رسولؐ (۲۴) خدا اور کائنات (۲۵) 1857ء کا جہاد (۲۶) روحِ نگارش (۲۷) مقامِ آمنہؓ (زیرِ تالیف) (۲۸) دل ہی تو ہے (غزلوں کا زیرِ ترتیب مجموعہ)

بقیہ از صفحہ 22 حضرت بابا گرونانک جی کے سفر۔۲

ہوئے کہنے لگا: ''اے میرے آقا تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اب مجھے یہ بتا کہ میری نجات کیسے ہوگی، میرے گناہ کیسے معاف ہوں گے؟ نانک نے کہا: ''خدا صرف دو طریقوں ہی سے انسان کے ماضی کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ ایک توبہ کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے جرائم کا کفارہ ادا کرے۔'' سجن نے آہ وزاری کرتے ہوئے کہا ''میں نہایت شرمندگی سے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے بہت سے لوگوں کو لوٹ کر ان کے گلے کاٹ دیئے اور اس طرح بہت سا مال و دولت جمع کرلیا۔ میں ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کا حقیقی درویش ظاہر کرتا ہوں۔ لیکن اب میں اپنے گناہوں کا کفارہ کیسے ادا کرسکتا ہوں؟'' گرونانک نے جواب دیا۔ ''تمہارے پاس جتنا بھی مال و اسباب ہے میرے پاس لے آؤ اور خدا کے نام پر غریبوں اور سادھوؤں میں تقسیم کردو۔'' سجن نے اس لمحے اپنے اندر ایک بڑی تبدیلی محسوس کی اور گرو کے کہنے پر عمل کیا۔ اس کے بعد خدا کا انتہائی عبادت گزار بندہ بن گیا۔ جو کوئی بھی اس واقعے کو سنتا وہ کہتا: ''نانک جی نے درحقیقت ایک معجزہ کر دکھایا ہے (یہ واقعہ کبیر والا کے قریب گاؤں مخدوم پور کا بیان ہوتا ہے)

یہاں سے نانک اپنے ساتھی مردانا کے ہمراہ سید پور (جو آج کل ایمن آباد کہلاتا ہے اور گوجرانوالہ کے قریب واقع ہے) پہنچے۔ اور لالو نام کے نچلی ذات کے ایک بڑھئی کے گھر قیام کیا۔ جلد ہی یہ بات پورے شہر میں مشہور ہوگئی کہ کھتری نسل کے ایک مقدس شخص نے ایک اچھوت کے ہاں مہمان رہنا پسند کیا ہے۔ یہ باتیں اعلیٰ ذات کے ایک مقامی افسر ملک بھاگو تک بھی پہنچیں۔ اس نے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا، جس میں دور ونزدیک سے بہت سے درویش لوگوں کو بلایا گیا۔ اس نے نانک کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ خدا کا نہایت برگزیدہ بندہ ہے۔ لہٰذا اس نے نانک جی کو بھی مدعو کیا۔ لیکن نانک جی نے یہ کہتے ہوئے وہاں جانے سے انکار کردیا: ''مجھے اپنے ہر طرف انتہائی غریب لوگ نظر آتے ہیں۔ میں تو محض انہی غریبوں میں سے ایک ہوں اور مجھے بڑے لوگوں کی مصاحبت کی کوئی خواہش نہیں ہے۔''

گرونانک کا یہ جواب سن کر ملک بھاگو آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ نانک کو اس کے سامنے لے کر آئیں اور اگر وہ اپنی مرضی سے نہ آئے تو زبردستی لے آئیں۔ پہلے تو گرو نے اس کے گھمنڈ کو دیکھتے ہوئے جانے سے انکار کردیا لیکن پھر سوچتے ہوئے رضامندی ظاہر کردی کہ شاید وہاں جانے سے ان متکبر لوگوں کو راہ راست پر لانے کا موقع مل جائے۔ نانک جی جب اپنے میزبان کے ہاں پہنچے تو ان کو کھانا پیش کیا گیا۔ لیکن بابا جی نے کھانے سے انکار کردیا۔ ملک بھاگو کے حواری اس توہین پر تلملا اٹھے اور انہوں نے توہین آمیز الفاظ میں نانک سے دریافت کیا ''بابا! تونے اتنے لوگوں کی موجودگی میں ملک صاحب کی بے عزتی کیوں کی ہے؟ ایک بلند مرتبت رئیس کے کھانے سے انکار اور اس نچلی ذات کے بڑھئی کی روکھی سوکھی روٹی سے پیار؟ یہ کہاں کی دانشمندی اور درویشی ہے؟''

''اس لئے کہ ملک صاحب کے کھانے سے ظلم واستبداد کے خون کی بو آتی ہے جبکہ اس محنت کش بڑھئی کی روٹی میں دودھ اور شہد کا ذائقہ ہے۔'' نانک جی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس پر لوگوں نے پوچھا ''یہ نتیجہ اخذ کرنے کی وجہ؟'' گرو جی نے جواب دیا ''لالو تر کھان خون پسینہ ایک کر کے روزی کماتا ہے اور اس کمائی میں سے مسافروں اور درویشوں کی خدمت کرتا ہے لہٰذا اس کا کھانا صحت بخش اور ذائقے دار ہوتا ہے۔ جبکہ تم لوگ خود کمانے کے بجائے ظلم وتشدد کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتے ہو اس طرح اس سے بے گناہ، کمزور اور غریب کے خون کی بدبو آنے لگتی ہے۔''

نانک جی کا اپدیش سن کر ملک بھاگو شرمندہ ہوا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی کہ بستی میں ایک ایسا درویش آیا ہے جس نے ذات پات کی تقسیم اور حکمرانی کے تصور کو مدلل گفتگو سے رد کرتے ہوئے اونچی ذات والوں کو لاجواب کردیا ہے۔

(ماخوذ از ''بابا نانک'' شائع کردہ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ص ص ۸۱۔۸۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

وحدت انسانی اور مساوات کے علمبر دار تاریخ ساز مصلح

از امتہ السلام سیما، ایم ایس سی

تمام قوموں کے لئے مصلح

’’اور ہم نے تجھے تمام قوموں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے‘‘۔ (۲۱:۱۰۷)

دنیا کی تاریخ میں بے شمار مصلح اور انبیاء کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور متعدد اولوالعزم انبیاء کا ذکر قرآن مجید بھی کرتا ہے۔ لیکن کئی امور میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حیرتناک کامیابی ہوئی ہے۔ اس کا اعتراف دشمن و دوست کو یکساں ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں ’’قرآن‘‘ کے عنوان پر جو مضمون ہے اس میں ان الفاظ میں یہ اعتراف آنحضرتؐ کے متعلق موجود ہے: ’’کہ آپؐ دنیا کے تمام انبیاء اور مذہبی اشخاص میں سب سے زیادہ کامیاب انسان ہیں‘‘۔ یہ اعتراف بلا وجہ نہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ دنیا میں کوئی مصلح نہیں آیا جس نے اپنی قوم کو اس گری ہوئی حالت میں پایا ہو جس میں آنحضرتؐ نے ملک عرب کو پایا۔ یہ لوگ نہ مذہب کے صحیح اصولوں سے واقف تھے۔ نہ تمدن اور معاشرت سے ان کو واسطہ تھا۔ نہ ان میں اتفاق و اتحاد کا کوئی شعور تھا۔ اور نہ ہی ایک قوم کی حیثیت سے کسی نظم و نسق کو اختیار کرنے کے لئے ان کے مزاج اور روایات تیار تھے۔ غرض ہر پہلو سے یہ قوم اصلاح طلب تھی اور اسی لئے تاریخ اس دور کو زمانہ جاہلیت قرار دیتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے پورا زور لگایا کہ کسی طرح ان میں کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے لیکن دونوں بری طرح ناکام ہوئے اور ان جنگجو قبائل میں کسی قسم کی اصلاح کی رمق نہ پیدا کر سکے۔ حنیف لوگوں کا گروہ جو بت پرستی سے پاک تھا۔ نیکی اور صلح پسندی جن کا وطیرہ تھا۔ ان کا وجود مسلسل موجود تھا۔ لیکن یہ تحریک جس کے افراد عرب کے ممتاز قبیلوں مثلاً قریش وغیرہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خالصتاً عرب تھے ان کی کوشش بھی کارگر نہ ہو سکی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر کئی قریش کے احباب کا اس سے تعلق تھا اور ان کو حنفاء کہا جاتا تھا۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت سے عاری اس قوم کو اپنی روحانی قوت سے ان کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ اور حلف الفضول جیسی تنظیموں کے ذریعہ مظلوم اور معاشرہ کے کمزور طبقہ کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تو لوگوں کو اس یتیم شخص کے اخلاص اور ہمت نے حیران کر دیا۔ اور ان کی زبان سے ان کے لئے امین کا لفظ بے اختیار نکلنے لگا۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس شخص کے کردار میں انسانیت کے لئے وہ درد اور جذبہ موجزن ہے۔ جس کا تجربہ ان کو اس سے پہلے عرب میں دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

قرآن مجید کی عملی تصویر

چند ہی سال کے عرصہ میں اس تنہا شخص نے ایسا انقلاب پیدا کر کے دکھا دیا کہ ملک عرب کے زمین و آسمان بدل گئے۔ ذلت آمیز بت پرستی اور انسانیت سے گری تو ہم پرستی سے نکل کر یہ بدو قوم توحید کے اس بلند مقام پر پہنچ گئی جس پر نہ اس سے پہلے کوئی قوم پہنچی نہ بعد میں پہنچ سکے گی۔

’’یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک نیک نمونہ ہے اس کے لئے جو اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔‘‘ (۳۳:۲۱)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کی تصویر آپ کی بہترین راز دار اور آپ کی بیوی حضرت عائشہؓ ان الفاظ میں کھینچتی ہیں: **کان خلقہ القرآن** یعنی آپ کا خُلق قرآن تھا۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کریم کی تعلیم عملی رنگ میں آپ کی روز مرہ کی زندگی میں نظر آتی تھی اور آپ قرآن شریف کی مجسم تعلیم تھے۔ پس جس طرح قرآن شریف زندگی کے سارے شعبوں میں اور قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی پرورش کے لئے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم دیتا ہے اسی طرح نبی کریمؐ کی زندگی ہر قسم کے اخلاق کا کامل مجموعہ اور بے نظیر نمونہ ہے اور ایک مسلمان کے لئے اگر احکام کے رنگ میں تعلیم قرآن شریف میں موجود ہے تو عملی رنگ میں آنحضرتؐ کی زندگی اس کا کامل مظہر ہے۔

فیاضی، عفو، انصاف اور دیانت کا مجسم پیکر

آیئے ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں۔ دشمنوں سے آپؐ اس قدر فیاضی سے پیش آتے کہ اس کی نظیر کسی دوسرے مصلح کی زندگی یا انسانی تاریخ

میں نہیں ملتی۔ عبداللہ بن ابی جس کی ساری عمر آپؐ سے سخت عداوت رکھنے میں گزری اور اس نے بظاہر مسلمان ہو کر منافقت کے ذریعہ کئی نازک موقعوں پر ان کو اور مسلمانوں کو بری طرح نقصان پہنچایا۔ اور بار ہا یہودیوں اور کفار کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا رہا۔ جب وہ فوت ہوتا ہے تو آپؐ نے اس کے بیٹے کی درخواست پر اس کے لئے دعائے مغفرت کی اور اپنی قمیص عطا کی جس کا اسے کفن پہنایا گیا تا کہ اس کی مغفرت ہو جائے۔ مکہ کے خطرناک دشمن جنہوں نے ایسے ایسے ظلم مسلمانوں پر اور خود آپؐ پر کیے جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذرا تصور تو کریں کہ جن لوگوں پر وہ ظلم وستم ڈھائے گئے ان پر کیا گزری ہوگی۔ جب آخر کار فتح مکہ میں ان پر فتح حاصل کرتے ہیں تو ان پر کسی قسم کی ملامت بھی نہیں کرتے۔ ایسے حالات میں کوئی دوسرا فاتح ہوتا تو اہل مکہ کو عبرتناک سزا دیتا مگر بیس سال کے لگاتار مظالم کو اور ان منصوبوں کو جو اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لئے ان لوگوں نے کئے بغیر کسی درخواست کے معاف کر دیا۔ بعض اوقات دشمنوں کے چھ چھ ہزار قیدی صرف ان کی درخواست پر فدیہ لئے بغیر رہا کر دئے گئے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ نے اپنی ذات کے متعلق کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ہاں ایسے لوگوں کو بعض اوقات سزائیں بھی دیں جنہوں نے غداری کر کے اسلام کو تباہ کرنا چاہا تھا۔ جہاں عفو سے اصلاح ہوتی تھی وہاں آپؐ نے انتہائی عفو سے کام لیا۔ لیکن جہاں سزا کی ضرورت ہوتی وہاں سزا بھی دیتے۔ ان شریروں کو جو قتل و غارت سے بعض نہ آتے تھے۔ آپؐ کی فیاضی بلا تفریق قوم و مذہب ہوتی۔ ایک عیسائی، یہودی یا مشرک سے آپؐ اسی طرح فیاضی کا سلوک کرتے، جس طرح ایک مسلمان سے۔ خیرات کو آپؐ نے مسلمانوں تک ہی محدود نہ کیا۔

انصاف کے معاملے میں آپؐ ایسے اعلیٰ اصول پر قائم تھے کہ سخت سے سخت دشمن اور عزیز سے عزیز دوست میں بھی کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ بعثت سے پہلے بھی آپؐ کی انصاف پسندی اور دیانت وامانت اس قدر مسلم تھی کہ لوگ اپنے جھگڑوں کے فیصلے آپؐ سے ہی کراتے تھے۔ مدینہ میں جب آپؐ تشریف لائے تو مشرکوں اور یہودیوں نے بھی آپؐ کو اپنے مقدمات اور تنازعات میں حکم تسلیم کیا۔ یہود کو اسلام اور مسلمانوں سے سخت عداوت تھی لیکن جب ایک یہودی اور مسلمان کا مقدمہ آپؐ کے سامنے آتا ہے تو آپؐ فیصلہ یہودی کے حق میں کرتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ ایک مسلمان اس وقت اسلام کی حفاظت کے لئے کس قدر قیمتی معاون ہے اور بعض وقت ایک کی علیحدگی سے ایک قبیلہ کی علیحدگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ آپؐ نے اپنی بیٹی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے عمل ہی تمہارے کام آئیں گے اور فرمایا کہ اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ وفات سے پیشتر عام مجمع میں فرمایا کہ کسی کا کچھ قرض مجھ پر ہو یا مجھ سے کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو وہ وصول کر لے۔ اور تکلیف کا قصاص لے لے۔

آپؐ دوسروں کے ساتھ معاملات میں کسی قسم کی زیادتی کبھی اختیار نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی نرم رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے۔ لین دین اور تمام معاملات میں اپنے تئیں نہایت ایمانداری کا طریق روا رکھتے۔ ایک یہودی کا آپؐ پر کچھ قرض تھا وہ طلب کرنے آیا اور نہایت بداخلاقی سے پیش آیا اور کہا کہ تم بنی ہاشم جب کسی سے کچھ لے لیتے ہو تو دینے میں نہیں آتے۔ یہ مدینہ کا واقعہ ہے جب آپؐ بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو اس کی گستاخی پر بہت غصہ آیا مگر آپؐ نے فرمایا: کہ اے عمرؓ مناسب تھا کہ تم ہم دونوں کو نصیحت کرتے۔ قرضخواہ کو یہ کہ مطالبہ کرنے میں سہولت سے کام لینا چاہیے اور مجھ کو یہ کہ قرض نیکی کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔ پھر اس کے قرض سے بڑھ کر اسے رقم ادا کی۔ اس حسن اخلاق کا ایسا اثر اس پر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ ایک موقع پر آپؐ اپنے احباب کے ساتھ کسی جنگل میں تھے۔ کھانا تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی سب کے سپرد ایک ایک کام کر دیا۔ اور فرمایا کہ ایندھن کے لئے لکڑیاں میں چن کر لاتا ہوں۔ باوجود بادشاہ اور معلم روحانی ہونے کے رعایا کے ایک معمولی آدمی کی طرح کام کرتے تھے۔ اپنے ماتحتوں اور نوکروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ دس سال کے عرصہ میں آپؐ نے کبھی مجھے جھڑکا تک نہیں۔ نوکر سے کوئی قصور ہو جائے تو اسے ملامت نہ کرتے تھے۔

بین المذاہب صلح جوئی اور رواداری کا بانیؐ

ایک بڑی خصوصیت جو آپؐ کو تمام انبیاء سے ممتاز کرتی ہے اور تمام عالم کے لئے رحمت ٹھہراتی ہے آپؐ نے ایک عظیم الشان صلح کن معاشرے کی بنیاد رکھی۔ نہ صرف مختلف انسانوں میں، نہ صرف مختلف قوموں میں، بلکہ ان سب میں مشکل کام یعنی مختلف مذاہب میں صلح کی بنیاد رکھنا اور تمام انسانوں میں مساوات کا عملی رنگ پیدا کیا اور کہا کہ میں بھی تمہاری طرح ہی ایک انسان ہوں۔ مرد اور عورت، نوکر اور آقا، جاہل اور عالم، اور بادشاہ اور رعیت سب ایک دوسرے پر حقوق رکھتے ہیں اور ہر ایک دوسروں کے متعلق ایک ذمہ داری کے نیچے آتا ہے۔ انسانیت کی صفت میں وہ سب ایک مقام پر کھڑے ہیں۔ حج کے اندر اس کا ایک عملی نظارہ بھی دکھا دیا کہ لاکھوں انسان ایک لباس میں، ایک حیثیت میں، ایک شکل میں اکھٹے کر کے دکھا دیئے۔ مساوات نسل انسانی کا نظارہ دنیا میں کہیں نظر آتا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے گرد طواف، صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور منیٰ اور عرفات کے مقامات پر لاکھوں لوگوں کا

عقیدت اور احترام سے ایک اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ پھر پانچ وقت کی نماز میں بھی کم وبیش یہی مساوات کا نظارہ نظر آتا ہے۔ خدا کے حضور بادشاہ اور درویش دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں۔ ملکی انتظام میں ایک غلام کو قریش پر حاکم مقرر کر کے دکھا دیا۔ حصول علم میں کوئی فرق مرد اور عورت کا نہیں رکھا۔ نہ چھوٹے اور بڑے کا۔ قوموں میں مساوات کے لئے یہ قاعدہ تجویز فرمایا کہ یہ قومیں اور قبیلے ایک دوسرے پر بڑائی کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف شناخت کے لئے اور ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے ہیں۔ اور بڑائی کا معیار اب دنیا میں قومیت نہ رہے گی بلکہ تقویٰ رہے گا۔ کالے گورے کا فرق۔ مشرقی اور مغربی کا فرق سب مٹا دیئے۔ سب ایک باپ کے بیٹے ہیں اور پھر سب سے مشکل کام بھی کر کے دکھا دیا یعنی مذاہب میں صلح جوئی اور رواداری کے لئے اصول بیان کر دیئے اور اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ یہ عظیم الشان کام کسی مصلح کے وہم میں بھی نہ آیا تھا۔ اور اس کا بنیادی اصول یہ قائم کیا کہ سب قوموں میں رسول آتے رہے ہیں۔ کوئی قوم خدا کے نعمائے روحانی سے محروم نہیں رہی اور ایک مسلمان کا فرض قرار دے دیا کہ وہ نہ صرف اپنے رسول پر ایمان لائے بلکہ جس قدر مختلف قوموں میں دنیا میں نبی اور رسول ہوئے ہیں ان سب پر بھی ایمان لائے بلکہ ان کو اور ان کے مذہبی رہنماؤں کو عزت و احترام کا مقام دیں۔ آپؐ سے پہلے کسی شخص کے منہ سے یہ کلمہ نہ نکلا تھا کہ دنیا کی ہر قوم میں رسول آتے رہے ہیں۔ جب ہم نے دنیا کے سب پیشواؤں کو سچا مان لیا تو نسلِ انسانی میں ایک ایسے اتحاد کی بنیاد قائم ہوئی جس کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ سب بھائی بھائی ہوگئے۔ پھر سب پیشواؤں کی عزت کرنا ہمارا فرض قرار پایا۔ یہاں تک کہ جن کو ہم باطل معبود سمجھتے ہیں ان کو بھی گالی دینے سے منع فرمایا۔ مذاہب میں صلح کی بنیاد یہ بیان کی کہ مختلف مذاہب میں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں صلح کی راہ بتادی اور فرمایا کہ جو امور سب مذاہب میں مشترک پائے جاتے ہیں ان کو بطور ایک بنیاد کے صحیح قبول کر لیا جائے۔ یعنی ایک خدا جو ساری انسانیت اور کائنات کا رب ہے۔ اور پھر تمام اعتقادات کو اس امر مشترک پر پرکھا جائے کہ وہ اس کے خلاف تو نہیں۔

مختصر یہ کہ اگر ایک طرف آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی عزت و جبروت اور اس کی ربوبیت اور رحیمیت کے تصور کو دنیا میں قائم کیا اور اس کی توحید کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا۔ تو دوسری طرف مساوات اور وحدت نسل انسانی کو بھی کمال تک پہنچا دیا اور انسان کی عزت و شرف کو دنیا میں بلند کیا۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید جیسی ابدی ہدایت کو رب العالمین کی طرف سے وحی کے ذریعے حاصل کر کے تا قیامت لوگوں کو اس لازوال نعمت سے نوازا۔ اللھم صلی علی محمد و علیٰ آل محمد و بارک وسلم علیہ۔

ملفوظات حضرت بانی سلسلہ احمدیہ

اخلاقی حالت کیسی ہو؟

دنیا فنا کا مقام ہے، آخر مرنا ہے۔ خوشی دین کی باتوں میں ہے اصلی مقصد تو دین ہی ہے

”اخلاقی حالت ایسی درست ہو کہ کسی کو نیک نیتی سے سمجھانا اور غلطی سے آگاہ کرنا ایسے وقت پر ہو کہ اُسے بُرا معلوم نہ ہو۔ کسی کو استخفاف کی نظر سے نہ دیکھا جاوے۔ دل شکنی نہ کی جاوے۔ جماعت میں باہم جھگڑے فساد نہ ہوں۔ دینی غریب بھائیوں کو کبھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ مال و دولت یا نسبی بزرگی پر بیجا فخر کر کے دوسروں کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھو۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک مکرّم وُہی ہے جو متقی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم دوسروں کے ساتھ بھی پُورے اخلاق سے کام لینا چاہیے۔ جو بد اخلاقی کا نمونہ ہوتا ہے وہ بھی اچھا نہیں۔ ہماری جماعت کے ساتھ لوگ مقدمہ بازی کا صرف بہانہ ہی ڈھونڈتے ہیں۔ لوگوں کے لئے ایک طاعون ہے۔ ہماری جماعت کے لئے دو طاعون ہیں۔ اگر کوئی جماعت میں سے ایک شخص برائی کرے گا تو اس ایک سے ساری جماعت پر حرف آئے گا۔ دانشمندی حلم اور درگذر کے ملکہ کو بڑھاؤ۔ نادان سے نادان کی باتوں کا جواب بھی متانت اور سلامت روی سے دو۔ یاوہ گوئی کا جواب یاوہ گوئی نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں کچھ ایسی ہی حکمت عملی تھی کہ اگر ایسا نہ کرتے تو روز ماریں کھاتے پھرتے۔ رُومیوں کی سلطنت تھی۔ یہود کے فقیہہ اور فریسی اس کے مقرب تھے۔ اس وقت اگر وہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال نہ پھیرتے تو روز ماریں کھایا کرتے اور روز مقدمے ہوتے۔ باوجودیکہ وہ ایسی نرم تعلیم دیتے تھے پھر بھی یہود انہیں دم نہ لینے دیتے تھے۔ اُس وقت کی حالت انجیل کی تعلیم ہی کو چاہتی ہوگی۔ اِس وقت ہماری جماعت کی موجودہ حالت بھی قریباً ویسی ہی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مارٹن کلارک عیسائی کے مقدمہ میں محمد حسین نے بھی اسی کی گواہی دی۔ اب سمجھ لو کہ قوم سے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ رہی گورنمنٹ اس کو بھی بدظن کیا جاتا ہے۔ اور گورنمنٹ کسی حد تک معذور بھی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بدظن ہو۔ کیونکہ عالم الغیب نہیں ہے۔ اس لئے ہم کو مطلع کرنا پڑا۔ تا کہ اس کو صحیح اور سچے واقعات کا علم ہو۔ مناسب ہے کہ ان ابتلا کے دنوں میں اپنے نفس کو مار کر تقویٰ اختیار کریں۔ میری غرض ان باتوں سے یہی ہے کہ تم نصیحت اور عبرت پکڑو۔

دنیا فنا کا مقام ہے، آخر مرنا ہے۔ خوشی دین کی باتوں میں ہے۔ اصلی مقصد تو دین ہی ہے۔“ (ملفوظات، جلد اول ص ص ۲۰۸، ۲۰۹)

مرتبہ: جسارت نذر رب، ایم۔اے

حضرت مولانا محمد علی صاحب کے قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر ''بیان القرآن'' کا لائبریری ایڈیشن شائع ہو گیا

26 مارچ نماز جمعہ کے بعد ایک مختصر تقریب میں حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ نے ''بیان القرآن'' کا نیا سیٹ محترم عبید اللہ بٹ صاحب کو پیش کیا

خطبہ جمعہ میں ناصر احمد صاحب نے تحریک احمدیہ لاہور کی علمی خدمات اور مغرب میں مذہبی مصنفین کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مثبت تبدیلی کے آثار پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ مغرب میں دفاع اسلام کے کام میں نئی حکمت عملی اور زیادہ علمی بالغ نظری اور بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ تحریک احمدیت نے اس دور میں تقلید کو چھوڑ کر اجتہاد کی راہ اختیار کی۔ لیکن قرآن مجید اور سنت رسول اکرم صلعم کے دامن کو نہ چھوڑا۔ تقلید کی وجہ سے اسلام تنقید کا نشانہ بنا۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے قرآن مجید کو بنیادی حیثیت دی اور تقلید کی بجائے اجتہاد کو بھرپور انداز میں اختیار کیا۔ اور دیگر مذاہب کے غلط تصورات اور اسلامی تعلیمات کی ابدیت اور اثر پذیری کو دلیری سے پیش کیا۔

تحریک احمدیہ لاہور نے بانی تحریک احمدیت کے علمی ورثہ کو حتی المقدور جاری رکھا۔ اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد علی صاحب، خواجہ کمال الدین صاحب، مولانا عبدالحق ودیارتھی صاحب، ڈاکٹر بشارت احمد صاحب، مولانا غلام حسن خان صاحب اور دیگر مصنفین اور مبلغین نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں جن کی تحریرات اور طرز فکر نے لوگوں کی رہنمائی کی۔

اس روایت اور طرز فکر کو زیادہ فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ مغرب میں ذرائع ابلاغ نئے انداز میں اسلام اور مسلمانوں پر وار کر رہا ہے جس کا جواب مسلمانوں کی طرف سے محض جذباتی انداز میں دیا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُسی انداز میں مسلمانوں کی طرف سے جارحانہ جواب ہو جو ان کے علمی حلقوں اور سوچنے والوں کو مثبت انداز میں سوچنے پر مجبور کرے۔ اس سلسلہ میں ناصر احمد صاحب نے برطانوی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ کی کتاب ''محمدؐ۔ زمانہ حال کے پیغمبر'' کے انداز فکر کے متعلق اس کتاب میں سے اقتباس پیش کئے۔ نماز جمعہ کے بعد ناصر احمد صاحب نے ''بیان القرآن'' کے ابتداء سے اب تک ایڈیشنوں کی تفصیل بتائی۔ اور موجودہ لائبریری ایڈیشن کی خصوصیت کا تعارف کروایا۔ حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مختصر خطاب میں طباعت کی تعریف کی اور محترم عبید اللہ بٹ صاحب اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کے عطیہ جات کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر ''بیان القرآن'' کے نئے سیٹ کی کاپیاں محترم بٹ صاحب کو پیش کیں۔ بعد ازاں بٹ صاحب نے حضرت امیر ایدہ اللہ اور ناصر احمد صاحب کا ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے محنت اور کوشش کا شکریہ ادا کیا اور احباب میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم ومغفور کے قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر مع عربی متن پہلی مرتبہ تین جلدوں میں ''بیان القرآن کے نام سے 22x29/8 سائز پر لتھو طریق طباعت کے ذریعہ 1922 تا 1924ء تین سال کے عرصہ میں شائع ہوئی۔ 1969ء میں نئے عربی متن اور ترجمہ وتفسیر کو نئے سرے سے کتابت کروایا گیا اور 22x26/8 سائز پر اس کا عکسی ایڈیشن شائع کیا گیا۔ لیکن حجم کو کم کرنے کی خاطر حاشیہ پر دی گئی بغلی سرخیوں کو جس سے قاری کو موضوع تلاش کرنے میں قدرے سہولت رہتی تھی ان کو حواشی کے اندر شامل کر دیا گیا۔ لیکن بغلی سرخیوں کو نمایاں کرنے کے لئے ان کو یا تو من وعن یا متعلقہ الفاظ کو حواشی کے اندر خط کشیدہ کر دیا گیا۔ ترجمہ وتفسیر کو چھوٹے سائز پر طبع کرنے پر متعدد احباب جماعت نے الفاظ کے باریک ہونے کی شکایت کی۔ چنانچہ جماعت کے ایک مخیر دوست نے -/50,000 روپے کا خصوصی عطیہ اس غرض کے لئے دیا کہ اس تفسیر کو پہلے کی طرح یعنی 18x23/4 کے بڑے سائز پر شائع کیا جائے۔ چنانچہ 1980ء میں یہ ایڈیشن شائع کیا گیا۔ لیکن بغلی سرخیاں بدستور حواشی کے اندر شامل رہیں۔ اور اب بھی صورت حال یہی ہے۔ کیونکہ بغلی سرخیوں کو حاشیہ پر لانے کے لئے پوری تفسیر کو نئے سرے سے کتابت یا کمپوز کروانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی موجودہ ایڈیشن میں فہرست مضامین، انڈیکس اور خط کشیدہ الفاظ سے قاری کو مطلوبہ مضامین کے متعلق کافی حد تک رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے نہایت مخلص بھائی عبید اللہ بٹ صاحب کی ایک مدت سے خواہش تھی کہ اول ایڈیشن کا ہی عکس ایڈیشن دوبارہ من وعن تین جلدوں میں شائع کیا جائے۔ جس میں بغلی سرخیاں باہر کی طرف حاشیہ پر دی گئی ہیں لیکن چونکہ لتھو ایڈیشن سے عکسی ایڈیشن طبع کرنے میں اتنی عمدگی نہ آسکتی تھی اس لئے اس کا عکسی ایڈیشن شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ بلکہ موجودہ عکسی ایڈیشن میں لتھو ایڈیشن کی طرح ہی بغلی سرخیوں کو حاشیہ پر کمپوز کروا کر تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ خدا کے فضل وکرم سے اس ایڈیشن میں عمدہ کاغذ، عمدہ طباعت اور جلد بندی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ناصر احمد صاحب نے اس کی طباعت اور زیبائش میں قابل ستائش محنت اور توجہ صرف کی ہے۔ تفسیر ''بیان القرآن'' کے اس ایڈیشن کے تقریباً تمام تر اخراجات محترم عبید اللہ بٹ صاحب اور ان کے خاندان کے مختلف احباب وخواتین نے بطور عطیہ عنایت فرمائے ہیں جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ محترم مولانا محمد یحییٰ بٹ صاحب مرحوم، مبلغ اسلام انگلستان وجرمنی اور ان کی بیگم صاحبہ ۲۔ محترم ناصر احمد بٹ صاحب ۳۔ محترم عبید اللہ بٹ صاحب کے مرحوم والدین اور موصوف کے مرحوم بیٹے کامران احمد بٹ صاحب۔ ۴۔ محترمہ عطیہ نذیر اعوان صاحبہ ہمشیرہ مولانا محمد یحییٰ بٹ صاحب مرحوم، ہمشیرہ کے مرحوم خاوند اور انہی کے مرحوم والدین۔ جزاھم اللہ۔ جو افراد اس معروف تفسیر کو لینے کے خواہشمند ہوں وہ ارشد علوی صاحب (نگران طباعت) سے رابطہ کریں:

ارشد علوی، نگران طباعت، دارالسلام کالونی، 5 عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
ٹیلیفون نمبر 042-35863260

ایک بھائی کا خراج عقیدت: مرتب: ناصر احمد

بیگم زمرد رمضان صاحبہ کی یاد میں

ایک نیک سیرت، دینی جذبہ سے سرشار اور بے لوث خدمت کی مثالی خاتون

بیگم زمرد رمضان صاحبہ جن کو ہم سب زمرد باجی کے نام سے پکارتے تھے اور اب بھی ان کی یاد اسی حوالے سے دلوں میں جاگزیں ہے۔ یہ وزیر آباد کے ایک شریف النفس اور خدمت خلق کرنے والے محترم بزرگ اور ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کی بیٹی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے وزیر آباد کی دکھی انسانیت کی بے لوث خدمت کی اور اس شہر کی گلیوں میں تا مرگ ڈیرہ ڈالے رکھا اور دولت کی لالچ میں کسی بڑے شہر کا رخ نہ کیا۔ افسوس ہے کہ یہ قابل اور دکھی انسانیت کا مونس و غمخوار شخص جلد رخت سفر باندھ کر دنیا سے رخصت ہوگیا اور اپنے پیچھے پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے چھوڑ گیا۔ ان کا چھوٹا سا کتابچہ "کامیاب زندگی" ان کی زندگی کے مقصد کی عکاسی کرتا ہے کہ ان کے دل میں دوسروں کی خدمت اور ان کی رہنمائی کا کتنا جذبہ موجزن تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی پانچ بیٹیاں، محمودہ، انور، سعیدہ، مسعودہ اور زمرد اور دو بیٹے محمد عبداللہ اور یوسف احمد نے مشکل حالات میں بھی نیکی، مہمان نوازی اور علم کے حصول کی روایت کو قائم رکھا۔ یوسف احمد صاحب نے انگلستان سے پی ایچ ڈی کی اور پی سی ایس آئی آر، لاہور میں ڈائریکٹر کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے۔ محمودہ صاحبہ نے ٹیچنگ کا پیشہ اختیار کیا اور پھر ان کی شادی ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ صاحب سے ہوگئی اور وہ شادی کے بعد برلین چلی گئیں۔ جنگ عظیم دوم کے شروع ہونے سے قبل ان کو جرمنی چھوڑنا پڑا۔ اور ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ صاحب کے ساتھ لاہور آگئیں۔ جہاں ڈاکٹر صاحب مرکزی انجمن کے جنرل سیکرٹری رہے اور بیگم محمودہ عبداللہ نے خواتین کو منظم کیا۔ اور احمدیہ بلڈنگس میں وہ خواتین کی سرگرمیوں کی روح رواں تھیں۔ وہ ایک قرینے سلیقے والی خاتون تھیں اور اپنی ملنساری، انکساری اور مہمان نوازی کی وجہ سے اپنا ایک مقام رکھتی تھیں۔ جلسہ سالانہ کے موقع پر ان کا گھر ایک مہمانخانہ ہوتا تھا۔ پھر 1947ء میں وہ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ صاحب کے ساتھ ووکنگ انگلستان چلی گئیں اور وہاں بھی مشن کے انتظام اور مہمان نوازی میں اہم کردار ادا کیا۔ زمرد باجی نے وزیر آباد میں رہ کر اس وقت بی اے کیا۔ جب لڑکیوں کو ہائی سکول کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لئے گجرات بسوں اور ریل گاڑی کے ذریعہ روزانہ جانا پڑتا تھا۔ اس دوران ان کی ہم سفر وزیر آباد جامع احمدیہ کے امام مولوی اللہ دتا صاحب کی صاحبزادی فاطمہ حکیم تھیں۔ مولوی اللہ دتا صاحب عربی اور فارسی کے استاد اور ایک درویش صفت انسان تھے۔ جلسہ سالانہ پر زمرد باجی اور ان کی دیگر ہمشیرگان سے ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن زمرد باجی اور فاطمہ حکیم کو بی ٹی کرنے کے لئے سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور آنا پڑا۔ اور ان دنوں زمرد باجی کا گھر کے سب لوگوں اور میری والدہ سے قریبی اور گہرا رشتہ پیدا ہوگیا۔ جلسہ سالانہ پر تقاریر کی تیاری اور پھر "پیغام صلح" کے لئے مضامین لکھنا وغیرہ گھر میں خوب علمی اور ادبی مجلسیں ہوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ خواتین کے "معاشرہ میں مقام" کے موضوع پر انہوں نے ایک مضمون لکھا اور میں نے اس کی کچھ تصحیح کی۔ ہمارے نہایت شفیق، عالم اور شاعر بزرگ مولانا مرتضٰی خان صاحب ان دنوں "پیغام صلح" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اس مضمون کو "ایک قابل قدر مقالہ" کے عنوان کے تحت شائع کیا۔ تو یہ ہم دونوں کے لئے ایک قابل فخر بات تھی۔ پھر زمرد باجی اور محترم بہن فاطمہ حکیم ننکانہ صاحب میں ٹیچر لگ گئیں۔ زمرد باجی کی شادی ہوگئی اور وہ لاہور آگئیں لیکن فاطمہ حکیم صاحبہ محنت اور لگن سے وہیں مقیم رہیں اور انہوں نے اس کو مڈل سے ہائی سکول منظور کروایا اور پھر اس کی تادم مرگ ہیڈ مسٹریس رہیں۔ زمرد باجی کی سرینام سے آنے والے نوجوان محمد فاضل رمضان سے شادی ہوگئی پھر وہ لاہور، سیالکوٹ اور پھر فاروقیہ (ہری پور) میں خاوند کے ساتھ ساتھ رہیں اور اپنی نیکی، وفا شعاری، مہمان نوازی اور دینی جذبہ کو ہر حال میں قائم رکھا۔ اور خاندانی روایات کو آگے بڑھایا۔ وہ کچھ وقت سرینام (جنوبی امریکہ) بھی رہیں لیکن بالآخر ہیگ، ہالینڈ میں سکونت اختیار کرلی۔ محمد فاضل صاحب ہالینڈ کے مشن ہاؤس واقعہ پولخرلان، ہیگ کے امام مقرر ہوگئے۔ اور زمرد باجی نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ اور بڑی محنت اور لگن سے بچوں اور بڑوں کو قرآن مجید ناظرہ اور دینی تعلیم دی۔ ویسے بھی ماشاء اللہ انہیں تقریر کرنے میں کافی مہارت تھی اور جلد وہاں اپنی نیکی، دینی جذبہ اور ملنساری اور انکساری سے ممتاز مقام حاصل کرلیا۔ اور سب لوگ ان کو محبت سے بھابی زمرد کہتے تھے۔ زمرد باجی کی دو بچیاں تھیں انہیں ان کی تربیت اور مستقبل کی فکر تھی پھر ان کی بڑی بہن انور رحمت اللہ صاحبہ جو راولپنڈی میں رہائش رکھتی تھیں ان کی بیماری کی وجہ سے لمبے عرصہ کے لئے ان کو پاکستان رہنا پڑتا۔ پھر انہوں نے دونوں بیٹیوں کی شادی سیالکوٹ میں کردی۔ ایک داماد جو ڈاکٹر ہے اس نے راولپنڈی میں پریکٹس شروع کی تو زمرد باجی راولپنڈی آگئیں۔ لیکن اب ان کی صحت کمزور رہنے لگی لیکن اس دوران بھی وہ مقامی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے علاوہ دینی خدمت کے جذبہ ان کو بے قرار رکھا۔ وہ تن تنہا ٹیکسی لے کر جمعہ کے لئے باقاعدگی سے تشریف لاتیں۔ انہوں نے روحانی قوت حاصل کرنے کے لئے تینوں امیروں کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مسعودہ عبداللہ فنڈ کو بڑھانے میں انہوں نے جوش و جذبہ سے دلچسپی دکھائی۔ محترمہ نجمہ سعادت صاحبہ جو ان کی بھانجی ہیں اس فنڈ کی ابتداء کے لئے انہوں نے -/5,000 کا عطیہ دیا جو اب بڑھ کر ایک لاکھ کی حد کو چھونے لگا ہے۔ اس میں سے لوگوں کو قرض حسنہ دیا جاتا ہے اور علاج معالجہ اور عیدین پر عطیہ جات بھی دیئے جاتے ہیں۔ پھر انہی کی تجویز پر حمائل شریف مترجم کو حواشی کے بغیر 30 پاروں میں شائع کیا گیا۔ بوڑھے لوگوں کی سہولت کے لئے انہوں نے پہلا پارہ بڑے سائز پر طبع کرنے کے لئے عطیہ دیا۔ لیکن افسوس کے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ زمرد باجی نے خاندان میں، جماعت میں، بیرونی ممالک میں اپنی نیکی، دینی جذبہ اور انکساری کے وہ نشان چھوڑے ہیں جو مجھے یقین ہے ان کی مغفرت کا ضرور موجب ہو رہے ہوں گے۔ ان کی محبت اور خلوص سے "ناصر بھائی" کی آواز آج بھی کانوں میں سنائی دیتی محسوس ہوتی ہے اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ میرے بچوں کے لئے ان کی دعائیں اور محبت ایک خوشگوار یاد اور صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت میں مغفرت اور رحمت سے نوازتا رہے۔ اور ان کی بیٹیوں کو جو ماں کا نمونہ ہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین

مرتب: ناصر احمد

جلسہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تنظیم خواتین احمدیہ، لاہور کے زیر اہتمام مورخہ 13 مارچ 2010ء بعد از دوپہر جامع دارالسلام، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوا

جب بھی خواتین کا کوئی اجلاس منعقد ہونے والا ہو تو جامع میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ آج خواتین کی کوئی میٹنگ یا کوئی تقریب ہونے والی ہے۔ جامع دارالسلام کے سامنے والے برآمدے کے دونوں طرف میزیں جن پر سفید چادریں بچھی ہوتی ہیں۔ ترتیب کے ساتھ دیواروں کے ساتھ لگی نظر آتی ہیں۔ ان پر چائے کے کپ چھوٹی پلیٹیں وغیرہ نہایت طریقے سے سجی ہوتی ہیں۔ ملحقہ کچن میں اس دن چائے کے ساتھ دی جانے والی اشیاء کی آمد ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی شور نہیں ہوتا نہ کوئی ہنگامہ۔ نہایت پرسکون طریق پر تمام کام ہو رہے ہوتے ہیں۔ اجلاس میں بولنے والی بچیاں اور خواتین پوری تیاری سے آتی ہیں۔ پروگرام پہلے سے مرتب ہوتا ہے اس لئے تفصیلات حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب بڑے احترام اور عمدگی سے ہوئی۔ مقررات نے اپنے اپنے موضوع پر پوری تیاری اور موثر انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کا مختصر خاکہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ اسی شمارے میں امتہ السلام سیما، ایم ایس سی کی تقریر کا متن قارئین کے ملاحظہ کے لئے درج کیا جا رہا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ دیگر تقاریر بھی بعد کے شماروں میں شامل کی جائیں۔

تلاوت قرآن کریم:	بیگم فائزہ عثمان صاحبہ۔ قرآن مجید کی سورت احزاب سے ان آیات کی تلاوت کی جن میں رسول اکرم صلعم پر درود بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔
منظوم کلام حضرت بانی سلسلہ احمدیہ:	بیگم سائرہ شفیق صاحبہ، راولپنڈی وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا۔۔
حدیث رسول اکرم صلعم:	درشہوار دختر چوہدری ایاز حیات
رسول اکرم صلعم رحمت کے مظہر اتم اور میلاد النبی صلعم کی ابتدا کس طرح ہوئی:	بیگم صفیہ سعید صاحبہ
منظوم کلام بانی سلسلہ احمدیہ رسول اکرم صلعم کی مدح میں:	زینب بنت احمد شجاع صاحبہ
منظوم کلام بانی سلسلہ احمدیہ: "خدا کے پاک بندوں کو خدا سے نصرت آتی ہے"	بیگم صباحت احمد صاحبہ
رسول اکرم صلعم، وحدت نسل انسانی اور مساوات کے علمبردار:	امتہ السلام سیما صاحبہ
رسول اکرم صلعم کی مثالی صداقت اسوہ حسنہ کی روشنی میں:	بیگم بشریٰ علوی صاحبہ
نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم:	آمنہ سعید صاحبہ
رسول اکرم صلعم کا تعلق باللہ اور اخلاق کاملہ:	بیگم جسارت نذر رب صاحبہ
واقعہ معراج النبی اکرم صلعم اور اختتامی دعا:	بیگم محمد احمد صاحبہ

اس مبارک تقریب کے بعد پر تکلف چائے کا اہتمام تھا جس کے لئے بیگم سعادت احمد صاحبہ، رقیہ عزیز صاحبہ اور بیگم زبیدہ محمد احمد صاحبہ شکریہ کی مستحق ہیں۔

حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ بیرونی دورجات پر روانہ ہو گئے

حضرت امیر ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب 28 مارچ 2010ء اتوار کی شام کو اپنے سالانہ دوروں پر روانہ ہو گئے ہیں۔ اس دورہ میں وہ آسٹریلیا، فجی، نیوزی لینڈ، اور انڈونیشیاء کی جماعتوں میں مختلف تقاریب میں شرکت کریں گے اور کئی اہم منصوبوں کا افتتاح بھی فرمائیں گے۔

29 مارچ کی صبح کو محترم عامر عزیز صاحب الازہری بھی فجی کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ وہ فجی جماعت کی سالانہ احمدیہ کونشن میں شرکت فرمائیں گے۔ حضرت امیر ایدہ اللہ بھی ان کے ساتھ اس کونشن میں شرکت فرمائیں گے۔

احباب وخواتین ان دونوں کی صحت اور خیریت کے لئے دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو خیریت سے واپس وطن لائے اور جس مقصد کے لئے دونوں تشریف لے گئے ہیں۔ اس میں ان کو کامیابی عطا فرمائے۔

15 سال پہلے — شبان الاحمدیہ مرکزیہ کی جھلکیاں

کاوش: اطہر رسول، ایم۔اے

شبان الاحمدیہ مرکزیہ کے تحت

صرف احباب جماعت کے لئے :- یوم وفات مسیح موعودؑ نمبر

مُدیر: اطہر رسول وڑائچ

ماہنامہ **شبان میگزین**

مشترکہ شمارہ : مئی جون ۱۹۹۵ء ، جلد 1 شمارہ ۴

اس شمارے میں

اردو سیکشن

ضروری اعلان: اب خبرنامہ ’شبان‘ ، ماہنامہ ’شبان میگزین‘ کے نام سے شائع ہوا کرے گا۔ (اس خاص شمارے سے متعلق آپ کی آراء کا شدت سے انتظار رہے گا۔)

اس رسالے کی تمام تر تیاری، فیصل آباد میں عمل میں آئی۔ جبکہ فوٹو کاپی اور ترسیل کا کام لاہور میں تکمیل کو پہنچا۔

باہتمام پاکستان پرنٹنگ ورکس کچا رشید روڈ لاہور سے چھپوا کر پبلشر چوہدری ریاض احمد صاحب نے دفتر پیغام صلح، دارالسلام۔۵۔عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن لاہور سے شائع کیا۔

۲۱ / اپریل ۹۵ء
بروز جمعۃ المبارک

اس تاریخ کو جامع دارالسلام کے نوٹس بورڈ پر 'شبان لائبریری' اور 'شبان بک بینک' کی ممبرشپ سے متعلق ہدایات آویزاں کر دی گئیں۔ جن کے مطابق مورخہ ۱۵ مئی بروز سوموار سے ان دونوں ذخائرِ کتب سے کتابیں جاری کرنے (ISSUE) کا آغاز کیا جائے گا۔

مئی

۵ مئی ۹۵ء
بروز جمعۃ المبارک

شبان الاحمدیہ مرکزیہ کی جانب سے ایک وفد نے جماعت بدوملہی کا دورہ کیا۔ اس دورہ کی جھلکیاں مندرجہ ذیل ہیں:

وفد چار اراکین پر مشتمل تھا۔ ۱) حماد الرحمٰن ۲) عتیق الرحمٰن ۳) طیب انوار الحق ۴) کاشف وحید

وفد نمازِ جمعہ سے قبل بدوملہی پہنچ گیا تھا۔

نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد مقامی شبان سے گفتگو کی گئی۔ مختلف موضوعات پر بات چیت ہوئی۔

۱۵ مئی ۹۵ء
بروز سوموار

شبان الاحمدیہ مرکزیہ کی جانب سے کیے گئے اعلان کے مطابق 'شبان لائبریری' اور 'شبان بک بینک' میں کام کا آغاز کیا گیا۔ 'شبان لائبریری' میں مختلف موضوعات پر کافی کتب جمع ہو چکی ہیں جبکہ 'شبان بک بینک' کے تحت بھی کافی درسی کتب اکٹھی کی جا چکی ہیں۔ دونوں مقامات پر دستیاب کتب کی فہرست، مسجد میں آویزاں کر دی گئی ہے تاکہ ہر ایک کو علم ہو سکے اور دلچسپی لینے والوں کے لئے سہولت رہے۔

گزارش ہے کہ.....

آپ سے گزارش ہے کہ اس رسالہ کو قیمتاً خریدنے کی کوشش کریں۔ اگرچہ ہم ہر ایک احمدی گھر میں یہ رسالہ ارسال کرتے رہیں گے، چاہے آپ اس کے پیسے دیں یا نہ دیں۔ بہرحال آپ کی جانب سے مالی تعاون، ہمارے کے لئے باعثِ اطمینان ہوگا۔ اور سہولت کا باعث بنے گا۔ اور ہمیں یہ بھی احساس رہے گا کہ ہم اس اہم جماعتی کام میں دلچسپی لینے میں اکیلے نہیں ہیں۔

اگر آپ اس رسالے کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں، تو فی پرچہ ۵ روپے کے حساب سے چھ ماہ کے پرچوں (دسمبر تک) کی قیمت، مبلغ ۳۰ روپے، مدیر 'ماہنامہ شبان میگزین' کے نام ارسال کر دیں۔ شکریہ۔

ھونہار طالب علم

جماعت کچھی - ہزارہ:
یاسر عزیز بن عبدالعزیز صاحب (مرحوم)، نے چھٹی جماعت کے امتحان میں 692/800 نمبروں کے ساتھ اسکول بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

جماعت فیصل آباد:
وردہ تبشیر بنت تبشیر سلیم ملھی نے پہلی جماعت کے سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ تقسیم انعامات کی تقریب میں، اپنے اسکول کی پرنسپل صاحبہ سے انعام وصول کرتے ہوئے۔

جماعت فیصل آباد:
اسامہ تبشیر بن تبشیر سلیم ملھی نے نرسری کلاس کے سالانہ امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ تقسیم انعامات کی تقریب میں اپنے اسکول کی پرنسپل صاحبہ سے انعام وصول کرتے ہوئے۔

FROM : SHABBAN-UL-AHMADIYYA MARKAZIA

SPECIAL NEWS LETTER (PICTURAL)

FOR AHMADIYYA COMMUNITY ONLY : Editor: Athar Rasool

دورہ اوکاڑہ

بمورخہ ۱۰ فروری ۱۹۹۵ء، بروز جمعۃ المبارک

وفد کے ارکان اور مقامی شبان الاحمدیہ شکار کے دوران

دائیں سے : ایاز عزیز
مظہر حیات
سعید احمد
عمر فاروق
شکیل جمیل
منور احمد
اطہر رسول

فوٹوگرافی : شہزاد عزیز

دورہ چک ۸۱ جنوبی سرگودھا

بمورخہ ۱۷ فروری ۱۹۹۵ء بروز جمعۃ المبارک

وفد کے ارکان اور مقامی شبان الاحمدیہ مع بزرگ : جامع مسجد چک ۸۱ میں

وفد کے ارکان کے علاوہ
نمایاں : چوہدری عزیز احمد
محمد حسن صاحب
اعجاز احمد صاحب
آفتاب احمد صاحب
اسد اللہ صاحب
سردار علی صاحب

فوٹوگرافی : اطہر رسول

دورہ قصور

بمورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۹۵ء بروز جمعۃ المبارک

وفد کے ارکان، چوہدری امان اللہ کے ساتھ : اُن کے گھر میں

دائیں سے :
بیٹھے ہوئے : امان اللہ صاحب
سعید احمد
کھڑے ہوئے : مظہر حیات
عتیق الرحمٰن
ارشد اللہ
اطہر رسول

فوٹوگرافی : کیمرے کے آٹومیٹک فنکشن کے ذریعہ

نمائندگان خصوصی برائے شبان الاحمدیہ مرکزیہ کا سہ ماہی اجلاس : جامع [illegible]

بمورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۹۵ء، بروز جمعۃ المبارک

نمائندگان خصوصی، شبان الاحمدیہ مرکزیہ کی کابینہ کے عہدیداران کے ساتھ :

دائیں سے : کاشف وحید
اطہر رسول
ظہور الرحمٰن
سعید احمد
شاکر اللہ جان
فرمان علی
طیب الزمان احمد
مجاہد احمد سعید
عتیق الرحمٰن

فوٹوگرافی : عثمان نذیر